# ہم کہاں کے سچے تھے



Hum Kahan Kay Sachay Thay

## عمیرہ احمد


**علم و عرفان پبلشرز**

الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔

فون: 37352332'37232336 فیکس: 37223584

www.ilmoirfanpublishers.com

E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

## انتساب!

اپنے پیارے شہر

سیالکوٹ

کے نام

# فہرست



❁......❁......❁

# پیش لفظ

''ہم کہاں کے سچے تھے'' میرا پہلا مکمل ناول تھا جس نے کرن میں اپنی اشاعت کے ساتھ مجھے فوری طور پر مقبولیت دلوائی۔ اگرچہ میرے بعد میں آنے والے ناولز کے برعکس اس میں کوئی بہت سنجیدہ قسم کے موضوعات شامل نہیں ہیں اور یہ ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے پاپولر فکشن کی ایک اچھی مثال ہے۔ لیکن اس کے باوجود پلاٹ کی تکنیک کے لحاظ سے یہ ایک آسان ناول نہیں ہے۔

اس ناول کو کتابی شکل میں لانے میں مجھے بہت تامل تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ میری ذاتی رائے میں یہ کسی اہم ایشو پر نہیں تھا اور شائد میں اپنی اسی رائے پر قائم رہتے ہوئے اس ناول کو کتابی شکل میں لانے سے گریز کرتی مگر TV کے لیے لکھنا شروع کرنے کے بعد جن کہانیوں کی ڈرامائی تشکیل کے لیے مجھ سے کہا جا رہا ہے ان میں ایک یہ ناول بھی ہے۔ کیونکہ TV کے میڈیم پر ایسی کہانیاں ناظرین میں فوری مقبولیت حاصل کرتی ہیں۔

''ہم کہاں کے سچے تھے'' کو کتابی شکل میں آپ کے سامنے لانے کی وجہ اسے TV سکرین سے پہلے آپ تک پہنچانے کی خواہش ہے۔

ہلال جرأت بلاشبہ اب تک لکھے جانے والے میرے افسانوں میں سب سے بہترین افسانہ ہے اسے حاصل ہونے والی پسندیدگی نے میرے اس خیال کی تصدیق کی ہے۔

''بند کواڑوں کے آگے'' کسی بھی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی میری پہلی کہانی ہے۔ جسے میں نے ایک سچے واقعے سے متاثر ہو کر لکھا۔ اس کہانی کی اشاعت نے ڈائجسٹس کی دنیا کے دروازے مجھ پر کھول دیئے۔ اگرچہ میں اسے بعد میں آنے والی تحریروں کے مقابلے میں کمزور ترین تحریر سمجھتی ہوں۔ مگر میں نے اسے تب لکھا تھا جب مجھے کہانی لکھنا نہیں آتا تھا اور اسے اس کتاب میں شامل کرنے کا مقصد صرف ان یادوں کو محفوظ کرنے کی خواہش ہے جب میں سمجھتی تھی کہ میں زندگی میں کبھی کوئی اچھی کہانی نہیں لکھ سکوں گی۔

عمیرہ احمد

umeraahmed@yahoo.com

# ہم کہاں کے سچے تھے

''پتا ہے مشعل تم میں سب سے بڑی خوبی کیا ہے جس نے مجھے یوں تمہارا اسیر کر رکھا ہے؟''
میری بات پر اس کی آنکھیں ستاروں کی طرح جگمگا اٹھی تھیں۔
''نہیں میں نہیں جانتی تم بتاؤ۔''
اس نے اپنی خوبصورت آواز میں کہا تھا۔
''یہ تمہاری ظاہری خوبصورتی نہیں ہے۔ ظاہری خوبصورتی بہت دیکھی ہے میں نے اور اتنی دیکھی ہے کہ تم اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہو۔ نہ تمہاری کسی اور چیز نے مجھے متاثر کیا ہے۔ یہ تو بس تمہارا سچ ہے جو مجھے جیت گیا ہے، تمہاری اسٹریٹ فارورڈنیس، تمہاری بولڈنیس، تمہاری uprighteousness، یہ وہ چیزیں ہیں جنھوں نے مجھے متاثر کیا ہے کیونکہ یہ ہر لڑکی میں نہیں ہوتیں اور خوبصورتی تو بہت سی لڑکیوں میں پائی جاتی ہے۔''
میں نے اورنج جوس کے سپ لیتے ہوئے کہا۔ وہ میری بات پر مسکرانے لگی۔
''خیر ایسی بھی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ سچائی میرے لیے تو یہ عام سی بات ہے۔ You know it's part of my life سو مجھے اس کے بارے میں کوئی بہت ایکسٹرا آرڈنری فیلنگز نہیں ہوتیں جیسے تمھیں ہو رہی ہیں۔''
''یار جو کوالٹی بندے میں ہو اسے ماننا چاہیے کہ ہاں یہ چیز ہے مجھ میں، یہ خاص بات ہے جو دوسروں میں نہیں ہے۔ انتظار نہیں کرتے رہنا چاہیے کہ کوئی دوسرا ہی تعریف کرے کیونکہ اب لوگ کسی کی تعریف مشکل سے ہی کرتے ہیں۔ تمھیں مان لینا چاہیے بلکہ فخر کرنا چاہیے کہ ہاں بھئی یہ خوبی ہے مجھ میں۔''
میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی سیاہ آنکھیں مجھ پر مرکوز کیے مسلسل مسکرا رہی تھی۔
''اچھی لگتی ہیں مجھے تمہاری باتیں لیکن کبھی کبھی میں حیران ہوتی ہوں کہ جن چیزوں کو تم admire کرتے ہو انھیں اب کہاں admire کیا جاتا ہے؟ جس طرح تم جھوٹ سے نفرت کرتے ہو اور سچ کا پرچار کرتے رہتے ہو، کیا تم اس دنیا میں کامیاب ہو سکتے ہو؟ کیونکہ خالی سچ کا علم لے کر پھرنے سے آخر ملتا کیا ہے؟ زندگی سچ کے علاوہ بھی

ہے مگر بعض دفعہ مجھے لگتا ہے جیسے تمھارے لیے سچ ہی سب کچھ ہے ایسے جیسے تمھیں سچ سے عشق ہو چکا ہے۔"

میں اس کی بات پر ہنس پڑا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ تم کہہ رہی ہو جو خود سچ بولنے والوں کے گروہ میں شامل ہے اور جو سچ کے لیے کوئی بھی نقصان اٹھانے کو تیار رہتی ہے۔ But I love the way you say these things اچھی بات ہے کہ تم اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہو، جو چیز تمھارے دل میں آتی ہے کہہ دیتی ہو۔"

"نہیں آئی سوئیر میں سیریس ہوں مجھے بتاؤ کہ تمھیں صرف سچے لوگ ہی کیوں اچھے لگتے ہیں؟ حالانکہ ضروری تو نہیں ہوتا کہ جو لوگ سچ بولتے ہوں وہ واقعی اچھے ہوں ہوسکتا ہے ان کے دلوں میں بغض ہو۔ وہ بناوٹ اور تضاد کا شکار ہوں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے کمپلیکسز چھپانے کے لیے خود پر سچائی کا پردہ ڈال لیا ہو اور درحقیقت ان سے بڑھ کر کوئی فراڈ ہی نہ ہو۔"

میں اس کی بات پر کچھ حیران ہوا تھا۔

"کیا تم ایسی ہو؟" وہ میرے سوال پر گڑبڑائی تھی اور پھر ہنس پڑی۔

"نہیں بھئی میں ایک جنرل سی بات کر رہی ہوں۔"

"میں نے آج تک کوئی ایسا بندہ نہیں دیکھا جو ظاہر میں سچا ہو اور باطن میں جھوٹا اس لیے میں تمھاری بات سے اتفاق نہیں کرتا۔"

وہ مجھے دیکھتے ہوئے پرسوچ انداز میں جوس کے سپ لینے لگی۔

"اور سناؤ تمھاری سٹڈیز کیسی جا رہی ہیں؟"

"ویسے ہی جیسے اب تک جا رہی تھیں۔ تفریح، تعلیم سب کچھ ساتھ ساتھ، ارے میں تو تمھیں بتانا بھول ہی گئی کہ مجھے یونیورسٹی کے میگزین کا ایڈیٹر چن لیا گیا ہے۔"

اس نے ایک دم گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"That's wonderful اور کتنے کارنامے کرو گی اب تو عادت سی ہو گئی ہے تمھارے معرکوں کے بارے میں سننے کی، مجھے حیرت ہوتی ہے کہ تم یہ سب manage کیسے کرتی ہو۔ مشکل نہیں لگتا یہ سب؟"

وہ میری بات پر فخریہ انداز میں مسکرائی تھی۔

"مشکل کیسی؟ ٹیلنٹ اور جذبہ ہونا چاہیے بندے میں پھر سب کچھ ہو جاتا ہے اور ویسے بھی مجھے تو کوشش بھی کم ہی کرنی پڑتی ہے کسی چیز کے لیے، ہر کام خود سے ہی ہو جاتا ہے۔ اب یہ میگزین کا معاملہ ہی لے لو۔ میں ذرا بھی willing نہیں تھی یہ ذمہ داری لینے میں کیونکہ اس میں بہت بکھیڑے ہوتے ہیں جس کی چیز publish کرو وہ خوش، باقی ناراض مگر ہمارے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ نے اصرار کر کے مجھے یہ ذمہ داری لینے پر مجبور کیا ہے۔ اب ہر جگہ بندہ انکار تو نہیں کرسکتا نا۔ پہلے ہی لٹریری کونسل کی ہیڈ ہونے کی وجہ سے اتنے کام سر پر پڑے ہوئے ہیں۔ اب میگزین کی مصیبت بھی شامل ہو گئی ہے مگر خیر کرنا تو ہے ہی۔"

ٹیبل پر ہاتھ ٹکائے وہ بولے جا رہی تھی اور میں اسے دیکھ رہا تھا۔
''اور اسٹڈیز کا کیا حال ہے؟ کہیں یہ نہ ہو کہ ان سرگرمیوں کی ساری کسر وہاں نکل جائے۔'' میں نے اسے چھیڑا۔
''جی نہیں اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ اس ہفتہ بھی اپنی اسائنمنٹ میں distinction لی ہے۔ میرے نوٹس ڈھونڈتا پھرتا ہے پورا ڈیپارٹمنٹ بلکہ میری اسائنمنٹ کی ایک کاپی ہمارے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ضرور لیتے ہیں۔''
''تو پھر توقع رکھی جائے کہ ٹاپ کرو گی تم؟''
''نہیں خیر اب ٹاپ کرنا تو بہت مشکل کام ہے۔ بہت genius ہیں ہماری کلاس میں۔ ویسے بھی یونیورسٹی میں ٹاپ کرنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔''
''And what about Mehreen? وہ بھی کافی اچھی ہوتی تھی اسٹڈیز میں۔''
مجھے یک دم مہرین کا خیال آیا تھا۔
''نہیں اچھی ہے وہ بھی، محنتی ہے۔'' اس نے آئس کریم کا bowl اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا جو ویٹر رکھ کر گیا تھا۔
''تمھارے تعلقات ویسے ہی ہیں اس سے کوئی بہتری نہیں ہوئی؟'' میں نے آئس کریم کا ویفر توڑتے ہوئے کہا۔
''دیکھو میں تو ہمیشہ اس سے اچھے طریقے سے ہی ملنے کی کوشش کرتی ہوں مگر اب وہ بات کرنا پسند نہیں کرتی تو پھر یہ میرا قصور تو نہیں ہے نا۔ ویسے بھی اسے بہت سے کمپلیکسز ہیں۔
تمھیں تو پتا ہی ہے اس کا، پھر یونیورسٹی میں وہ بہت فضول باتیں پھیلاتی پھرتی ہے میرے بارے میں لیکن میں ہمیشہ اگنور کر دیتی ہوں After all she is my cousin پر کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ وہ بہت ابنارمل ہے، حد سے زیادہ اور پھر وہ جیلس بھی بہت ہوتی رہتی ہے حالانکہ میں یونیورسٹی میں اس کے لیے ہمیشہ مواقع فراہم کرنے کی کوشش کرتی ہوں مگر جس چیز میں میں حصہ لیتی ہوں وہ کبھی بھی اس میں حصہ نہیں لیتی، avoid کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے مجھے۔ اور مسئلہ یہ ہے کہ میں تو تقریباً ہر چیز میں ہی حصہ لیتی ہوں اور اس وجہ سے اسے ہمیشہ بیک گراؤنڈ میں ہی رہنا پڑتا ہے۔''
''اسے کیا ہو گیا ہے؟ پہلے تو ایسی نہیں تھی وہ بہت اچھی باتیں کیا کرتی تھی۔ امی تو ابھی بھی اس کی تعریفیں کرتی رہتی ہیں۔ اب اسے کیا ہو گیا ہے؟ کبھی چلے جاؤ تو وہ مجھ سے بات نہیں کرتی۔ میں خود ہی سلام دعا میں پہل کرتا ہوں حالانکہ پہلے تو اچھی دوستی تھی ہماری۔''
مجھے بھی اس کی طرح مہرین سے شکایتیں تھیں۔
''تمھیں avoid کرنے کی وجہ تو بہت واضح ہے۔ اب تمہاری مجھ سے دوستی ہے سو وہ یہ کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی بندہ جو اس کا دوست ہے وہ مجھ سے بھی دوستی رکھے تمھیں چھوڑنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اب تم

مجھ سے ملنے لگے ہو بلکہ ہو سکتا ہے اسے ہماری پسندیدگی کا بھی اندازہ ہو گیا ہو۔''

اس نے مجھے تفصیل سے کہا۔

''اگر یہ وجہ ہے تو یہ بہت احمقانہ سی بات ہے، آفٹر آل ہر شخص کو آزادی ہوتی ہے کہ وہ جس سے چاہے دوستی کرے یا جسے چاہے پسند کرے۔''

میں اس کی بات پر کچھ اُلجھ گیا تھا۔

''چھوڑو اس کے بارے میں جتنا سوچو گے اتنا پریشان ہو گے۔ یہ بتاؤ کہ واپس کب جا رہے ہو؟''

''ابھی تو ایک ہفتہ اور ہے اور پھر شاید نو یا دس کو جس دن فلائٹ کا انتظام ہو سکا۔'' میں نے آئس کریم کھاتے ہوئے اسے اپنا شیڈول بتایا تھا۔

''اور پھر کب آؤ گے؟'' اس نے پوچھا۔

''چار چھ ماہ بعد۔ ویسے تو میں کوشش کر رہا ہوں کہ میری پوسٹنگ پاکستان میں ہی ہو جائے مگر ابھی فی الحال ایک دو سال تک اس کا کوئی امکان نہیں، ڈیڑھ دو سال بعد جب پوسٹنگ یہاں ہو جائے گی تو کافی آسانی ہو جائے گی مجھے۔ امی بھی اکیلی ہوتی ہیں ان کے بارے میں بھی میری پریشانی ختم ہو جائے گی۔''

''خط لکھتے رہو گے نا؟''

''ہاں بالکل یہ کام کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ سفید رنگ اچھا لگتا ہے تم پر، پہنا کرو۔''

وہ میری بات پر مسکرانے لگی۔

''تمہیں گھر ڈراپ کروں یا ہمارے گھر چلو گی؟''

''نہیں مجھے گھر ہی ڈراپ کر دو، کافی دیر ہو گئی ہے، اس وقت میں یونیورسٹی سے گھر پہنچ چکی ہوتی ہوں۔ آج تو تمھارے لیے جھوٹ بولنا پڑے گا کہ یونیورسٹی سے کسی دوست کے ساتھ چلی گئی تھی۔''

اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر اسے ڈراپ کرنے کے بعد میں واپس گھر آ گیا تھا۔

............❁............

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی میری نظر مہرین پر پڑی تھی۔ وہ امی سے باتوں میں مشغول تھی۔ کچھ حیرت ہوئی اسے دیکھ کر کیونکہ جب سے میں پاکستان آیا تھا وہ پہلی بار ہمارے یہاں آئی تھی۔

''السلام علیکم! آج تو بڑے بڑے لوگ موجود ہیں اس غریب خانے میں۔''

وہ میری آواز پر چونک اٹھی تھی مگر اس نے جواب نہیں دیا۔

''ہاں آتی تو یہ مشکل سے ہی ہے آج بھی بڑے جتنوں سے لائی ہوں اسے ورنہ یہ تو آج بھی نہیں آ رہی تھی۔''

امی نے میری بات کے جواب میں کہا تھا۔

''نہیں خالہ بس کام ہی اتنا ہوتا ہے کہ کہیں آنے جانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ ایم اے کی پڑھائی کتنی مشکل ہوتی ہے۔''

"پتا ہے بھئی ایم اے کی پڑھائی بہت مشکل ہوتی ہے مگر اور بھی تو لوگ ہیں جو یہ مشکل کام کرتے ہیں، مشعل بھی تو ہے نا۔ اس نے تو پڑھائی کے ساتھ ہر قسم کی سرگرمی پال رکھی ہے اور پھر بھی یہاں آتی جاتی رہتی ہے۔"
میں صوفہ پر بیٹھتے ہوئے نادانستہ طور پر اسے مشعل سے کمپیئر کر گیا تھا۔ اس نے الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔

"میں مشعل نہیں ہوں۔" عجیب سی سرد مہری تھی اس کے لہجے میں۔

"ہر کوئی مشعل جیسا ہو بھی نہیں سکتا۔"

میں کہتے کہتے رک گیا۔ یک دم مجھے خیال آیا کہ وہ مشعل کو پسند نہیں کرتی، میری اس بات پر ناراض ہو سکتی ہے۔
"آ جایا کرو امی سے ملنے ان کا دل بھی بہلا رہے گا اور تمھیں بھی لوگوں سے ملنے جلنے کی عادت پڑے گی۔"
میں نے بات بدل دی تھی۔ اس نے مجھ پر ایک نظر ڈالی تھی اور چپ رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک لاؤنج ہی میں بیٹھا رہا اور پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کی کمپنی میں بیٹھنا آسان نہیں تھا، کافی اعصاب شکن تجربہ تھا یہ۔ وہ میری ہر بات کے جواب میں خاموش رہی تھی یا اگر کچھ کہا بھی تو بہت مختصر اور وہ جواب بھی کافی حوصلہ شکن تھے۔
پتا نہیں اب اسے کیا ہو گیا تھا؟ ورنہ پہلے تو وہ ایسی نہیں ہوتی تھی۔ مجھے یاد تھا کہ دو تین سال پہلے تک اس سے میری کافی دوستی تھی۔

اپنے باپ کی ڈیتھ کے بعد وہ اپنی امی کے ساتھ ننھیال میں آ گئی تھی۔ تب اس کی عمر شاید آٹھ نو سال ہو گی اور میں اس وقت بارہ یا تیرہ سال کا تھا۔ میری امی اکثر اسے اپنے گھر لے آیا کرتی تھیں اور مجھے ہمیشہ اس کے ساتھ کھیلنا اچھا لگتا تھا حالانکہ شروع شروع میں اسے اپنے ساتھ کھیل میں شامل کرنے کے لیے بہت جدوجہد کرنی پڑتی تھی مجھے۔ وہ کبھی میرے کھلونوں کو ہاتھ نہیں لگاتی جہاں امی اسے بٹھا دیتیں وہ وہیں بیٹھی رہتی۔ بہت خوفزدہ اور سہمی ہوئی لگتی تھی وہ تب، ہمارے گھر کی چیزوں کو وہ حیرانگی سے دیکھتی مگر نارمل بچوں کی طرح کبھی بھی انھیں ہاتھ لگانے کی کوشش نہ کرتی مگر آہستہ آہستہ امی اور میں نے اسے بہت حد تک نارمل کر دیا تھا۔

حبیبہ خالہ کی شادی کسی بہت امیر گھرانے میں نہیں ہوئی تھی۔ میری امی کے برعکس وہ ایک مڈل کلاس گھرانے میں بیاہی گئی تھیں۔ ان کے شوہر واپڈا میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ شروع کے دو چار سال انہوں نے اچھے گزارے مگر پتا نہیں کیا ہوا کہ خالہ کے شوہر نے اچانک ہیروئن استعمال کرنا شروع کر دی۔ پہلے وہ چوری چھپے نشہ کرتے تھے پھر خالہ کو پتا چل گیا تو انھوں نے کھلے عام یہ کام کرنا شروع کر دیا اور پھر اس کی مقدار بھی زیادہ ہوتی گئی پھر ان کی نوکری بھی چھوٹ گئی اور آہستہ آہستہ ہی سہی مگر ان کے حالات بہت خراب ہوتے گئے۔
میرے نانا خالہ کی تھوڑی بہت مدد کرتے رہتے تھے اور اس کی وجہ سے کبھی ان کے ہاں فاقوں کی نوبت نہیں آئی۔ خالہ کے شوہر کے مرنے سے سب کو یک دم سکون مل گیا تھا۔ اگر وہ نہ بھی مرتے تو بھی میرے نانا اور ماموؤں نے خالہ کو طلاق دلوانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر انھیں خالہ کے شوہر کے مرنے کی وجہ سے یہ مسئلہ فیس کرنا ہی نہیں پڑا۔
خالہ کے شوہر کے مرنے کے دو سال بعد ہی خالہ کی شادی کر دی گئی تھی اور مہرین کو ننھیال میں چھوڑ دیا گیا

تھا کیونکہ خالہ کے دوسرے شوہر یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ مہرین بھی خالہ کے ساتھ آئے۔ مجھے تب مہرین سے بہت ہمدردی محسوس ہوتی تھی، مجھے لگتا تھا کہ وہ بالکل اکیلی ہے، اس کا کوئی خاندان ہی نہیں ہے، نہ ماں باپ، نہ بہن بھائی اور نہ ہی کوئی دوست سولاشعوری طور پر میں اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کرتا رہتا تھا اور رفتہ رفتہ ہمارے درمیان بہت اچھی دوستی ہوگئی تھی۔

وہ کیا سوچتی تھی وہ مجھے یہ تو کبھی نہیں بتاتی تھی اور نہ ہی مجھے کبھی یہ اندازہ ہو پایا کہ وہ اپنے ماضی اور حال سے کس قدر متاثر ہوئی ہے مگر وہ باتیں اچھی کیا کرتی تھی۔ مجھے ہمیشہ ہی یہ لگتا تھا جیسے وہ بہت کچھ پڑھتی اور سوچتی رہتی تھی اور یہ دوستی اس کے میٹرک میں ہونے تک رہی پھر میں نے لندن اسکول آف اکنامکس میں داخلہ لے لیا اور انگلینڈ آ گیا۔ جب سال کے آخر میں، میں پاکستان چھٹیوں میں واپس آیا تو وہ اپنی امی کے پاس گئی ہوئی تھی کیونکہ وہ بیمار تھیں۔ اس سے میری ملاقات نہیں ہو پائی مگر تب میری دوستی مشعل سے ہونا شروع ہوگئی اور یہ دوستی ایک طوفانی رفتار سے ہوئی تھی۔

جب تک مہرین سے میری دوستی تھی کسی اور کزن سے میں زیادہ فری نہیں تھا اور یہی وجہ تھی کہ مشعل سے بھی میری صرف سلام دعا تھی حالانکہ ہم اکثر ملتے تھے۔ مگر جب واپس آنے کے بعد میں مشعل سے ملا تو وہ مجھے بہت بدلی ہوئی لگی۔ اب وہ پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ خوبصورت تو وہ ہمیشہ سے ہی تھی مگر اب کچھ ایکسٹرا آرڈنری قسم کی چیز آ گئی تھی اس میں، وہ بہت بولڈ اور بہت صاف گو ہوگئی تھی۔ اور مجھے اس کی صاف گوئی پسند آئی تھی۔ یہ بات تو مہرین میں بھی نہیں تھی۔ مشعل کو قائل کرنا آتا تھا اور وہ بہت فراخ دل تھی اور یہ خوبیاں مجھے کسی اور میں نظر نہیں آئی تھیں۔

اور صرف میں ہی نہیں تھا جو اس کا مدح سرا تھا۔ تقریباً سارا خاندان ہی اس کے طور طریقوں کے گن گایا کرتا تھا۔ مجھے تب پہلی دفعہ پتا لگا کہ وہ شاعری بھی کرتی ہے اور وہ بھی دونوں زبانوں میں اور جب میں نے اس کی شاعری سننے پر اصرار کیا تھا تو اس نے کہا تھا۔

”صرف ایک شرط پر سناؤں گی اگر آپ یہ کسی اور کو نہ سنائیں بلکہ کبھی کسی کو بتایئے گا بھی مت کہ میں شاعری کرتی ہوں کیونکہ آپ کو پتا ہے کہ ہمارے خاندان میں اس قسم کی چیزیں پسند نہیں کی جاتیں۔“

میں نے اسے یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ اس معاملے میں بالکل بے فکر رہے اور پھر اس نے مجھے اپنی چند انگلش اور اردو نظمیں سنائی تھیں اور میں اس کی شاعری سن کر حیران رہ گیا تھا۔ اس کی شاعری بہت میچور تھی۔ اس میں عامیانہ پن نہیں پایا جاتا تھا۔ وہ عام ہوتے ہوئے بھی بہت خاص تھی۔

”تم اگر اسی قسم کی شاعری لکھتی رہیں تو بہت آگے جاؤ گی۔“

میں نے اسے کہا تھا اور وہ مسکرادی۔

”آگے جانے کے لیے شاعری واحد ذریعہ نہیں ہے میرے پاس۔“

میں نے اس کے جملے کو سراہا تھا اور کچھ اور قائل ہو گیا تھا اس کی شخصیت کا۔ چھٹیاں گزارنے کے بعد میں واپس انگلینڈ آ گیا مگر مشعل سے میرا رابطہ ٹوٹا نہیں تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو خط لکھا کرتے اور کبھی کبھار فون پر بھی

بات کر لیتے۔ مہرین تب بالکل بیک گراؤنڈ میں چلی گئی تھی۔ اس سے میرا رابطہ بالکل ختم ہو چکا تھا۔ نہ میں نے اسے استوار کرنے کی کوشش کی نہ ہی اس کی طرف سے ایسی کوئی کوشش ہوئی۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا۔ میں مشعل کے سحر میں اور زیادہ گرفتار ہونے لگا تھا۔ وہ اپنی ہر کامیابی کی خبر سب سے پہلے مجھے ہی دیتی تھی اور ایسی خبریں وہ دیتی ہی رہتی تھی۔ کبھی وہ debate جیتتی کبھی کسی مشاعرے میں کارنامہ دکھاتی کبھی کسی لٹریری سوسائٹی کی صدر چنی جاتی کبھی کالج میگزین کی ایڈیٹر منتخب کی جاتی اس کے کارناموں کی ایک لمبی فہرست تھی جن پر مجھے بھی فخر ہوتا تھا۔

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ خدا کسی کو ظاہری خوبصورتی، ذہانت، صداقت اور کامیابی ایک ساتھ ہی دے دے اور مشعل کے روپ میں ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ اپنے ہر روپ میں یکتا اور باکمال تھی۔ وہ کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتی تھی۔ بہت soft spoken تھی۔ کم از کم میں نے اسے کبھی بھی کسی کے ساتھ ترشی سے یا اونچا بولتے نہیں سنا تھا۔

پھر جب اس سے اگلے سال میں واپس پاکستان آیا تو مجھ سے سامنا ہونے پر مہرین ایسے ملی تھی جیسے پہلی دفعہ مل رہی ہو۔ اس کے انداز میں شناسائی کی کوئی جھلک نہیں تھی اور جب ایسا دو تین بار ہوا تو پھر میں نے بھی اسے avoid کرنا شروع کر دیا۔ آخر اپنی انسلٹ کروانا تو کوئی بھی نہیں چاہتا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے مہرین میرے ساتھ رسمی سلام دعا بھی نہیں رکھنا چاہتی، مجھ سے وہ اتنی ہی بیزار نظر آتی تھی۔

ان دنوں اس نے ہمارے گھر آنا بھی ترک کر دیا تھا۔ ہر ایک کو اس سے شکایتیں رہنے لگی تھیں۔ وہ جھگڑالو نہیں تھی مگر وہ کسی کا لحاظ بھی نہیں کیا کرتی تھی۔ ننھیال میں کسی سے بھی اس کی دوستی نہیں تھی۔ وہ ہر ایک سے الگ تھلگ اور کٹی ہوئی رہتی تھی۔

اس کی امی اس کے لیے ماہوار خرچہ بھجوایا کرتی تھیں سو مالی طور پر وہ کسی پر بوجھ نہیں تھی مگر سماجی لحاظ سے کوئی بھی اسے پسند نہیں کرتا تھا۔

مشعل کبھی کبھی اس کے بارے میں بات کرتی تھی اور مہرین کی عادات کے بارے میں سن کر مجھے اس سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ بچپن کی وہ ہمدردی یک دم غائب ہو گئی تھی جو مجھے اس سے تھی۔ میرا خیال تھا اور اب بھی ہے کہ جب انسان بڑا ہو جاتا ہے تو اسے اپنی کمزوریوں اور محرومیوں کا خود سدباب کرنا چاہیے۔ ساری زندگی آپ اپنے ماضی کی محرومیوں کے بارے میں رو رو کر تو لوگوں سے مراعات نہیں لے سکتے اور پھر ایسا کون ہے اس دنیا میں جو محروم نہ ہو؟

کوئی نہ کوئی کمی یا خامی تو ہر شخص کے ساتھ لگی رہتی ہے پھر وہ بھی عام انسانوں میں سے تھی ساری مشکلات کو اسے خود ہی face کر کے حل کرنا چاہیے تھا مگر اس نے فرار کے جو راستے تلاش کر لیے تھے۔ وہ دوسروں کے لیے بھی تکلیف کا باعث بن رہے تھے۔

پھر میں لندن واپس چلا گیا تھا اپنی تعلیم مکمل کرنے اور تعلیم مکمل کرتے ہی میں نے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کر لی تھی۔ امی کو میرا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔ مگر میں نے ان کی خفگی کی زیادہ پروا نہیں کی۔ جو مراعات اور تنخواہ مجھے وہ کمپنی دے رہی تھی ان کا میں پاکستان میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پھر میری عادات ایسی تھیں کہ پاکستان کا ماحول مجھے سوٹ نہیں کرتا تھا۔ مجھے سچ بولنے اور سننے کی بیماری تھی اور ایسے بندے کو پاکستان میں ٹھوکریں

کے سوا کچھ اور نہیں ملتا۔ لندن میرے لیے ہر لحاظ سے بہتر تھا۔

انہی دنوں میرے والد کا انتقال ہوگیا اور یک دم میری ذمہ داری میں بے حد اضافہ ہوگیا تھا۔ اکلوتا تھا اس لیے ان ذمہ داریوں کے بوجھ کو زیادہ محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ امی میرے پاس لندن آ جائیں لیکن وہ پاکستان چھوڑنے پر تیار نہیں تھیں سو مجھے ہی جھکنا پڑا اور میں نے اپنی کمپنی کی پاکستان برانچ میں ٹرانسفر کے لیے کوشش شروع کر دی تھی لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ ہوتے ہوتے بھی اسے ایک دو سال لگ ہی جانے تھے۔

جاب ملنے کے بعد جب بھی میں پاکستان آیا مہرین سے میری ہر ملاقات ایک اجنبی کی طرح ہی ہوئی، یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ میں اسے ناپسند کرنے لگا تھا۔ مگر میرا نہیں خیال کہ میری ناپسندیدگی نے اس پر کوئی اثر کیا تھا۔ ایسا تو نہیں تھا کہ وہ یہ جانتی ہی نہ ہو کہ میں اسے ناپسند کرنے لگا ہوں مگر پھر بھی اس نے اپنا کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

وہ بہت سے کمپلیکسز میں مبتلا لڑکی تھی جن میں پہلا کمپلیکس شاید معمولی شکل کا تھا۔ اور اس کے بعد یقیناً اپنا بیک گراؤنڈ اور مالی حالات کا نمبر آتا ہوگا۔ میں سوچتا رہتا تھا کہ اتنے بہت سے کمپلیکسز کے ساتھ وہ زندہ کیسے ہے اور آئندہ دنیا کو کیسے فیس کرے گی مگر یہ بات میں نے اس سے کبھی کہی نہیں۔ آج بھی اسے دیکھ کر میرے ذہن میں پچھلی ساری باتیں گھوم گئی تھیں۔

............❁............

اپنے کمرے میں آنے کے بعد میں دیر تک اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ اسے کسی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت تھی جو اس کے کمپلیکسز کم کر سکے، جو اس میں تھوڑی سی خود اعتمادی پیدا کر سکے مگر یہ تجویز میں کبھی بھی مہرین کے سامنے پیش کرنے کی ہمت نہیں کر سکا، کسی کو یہ سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے کہ اسے ذہنی علاج کی ضرورت ہے تاکہ وہ ایک متوازن اور نارمل زندگی گزار سکے۔

وہ شام تک ہمارے گھر ہی ٹھہری تھی پھر امی میرے کمرے میں آئی تھیں۔ میں اس وقت کچھ کام کر رہا تھا۔

''اسود تم مہرین کو گھر چھوڑ آؤ۔'' انھوں نے مجھے کہا میں نے گھڑی پر وقت دیکھا شام کے چھ بجے تھے۔

''ٹھیک ہے میں آتا ہوں۔'' میں نے کاغذات سمیٹتے ہوئے کہا۔ وہ چلی گئی تھیں۔

گاڑی کی چابی لے کر میں جب باہر آیا تو وہ امی کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھی مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آؤ'' میں نے لاؤنج کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ امی بھی باہر پورچ میں آ گئی تھیں۔ میں نے کار میں بیٹھ کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا مگر اس نے بیک ڈور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں پیچھے بیٹھوں گی۔''

''کوئی بات نہیں مہرین آگے بیٹھ جاؤ تم کون سا کسی غیر کے ساتھ جا رہی ہو۔''

اس کے چہرے پر ناگواری کی لہر آئی تھی مگر کسی پس و پیش کے بغیر وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''مشعل کبھی ایسا نہ کہتی۔'' ایک سوچ میرے دماغ میں لہرائی تھی۔ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے میں نے اس سے کہا تھا۔

''بندے کو ہر کام اپنی مرضی سے کرنا چاہیے اگر تم پیچھے بیٹھنا چاہتی تھیں تو تمھیں چاہیے تھا کہ تم پیچھے بیٹھنے پر ہی اصرار کرتیں۔'' اس نے ایک نظر میرے چہرے پر ڈالی لیکن چپ رہی۔

''تمہاری امی کیسی ہیں؟'' گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا تھا۔

''سب ٹھیک ہیں۔'' ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

''مستقل رابطہ رہتا ہے ان کے ساتھ؟''

''پتا نہیں۔'' میں اس کے جواب پر حیران نہیں ہوا تھا وہ ایسی ہی تھی۔

''تعلیم مکمل کرنے کے بعد کیا کرو گی؟''

''پتا نہیں۔'' اس نے پھر اسی لہجے میں جواب دیا تھا۔ میں جان گیا کہ وہ میرے سوالوں میں دلچسپی لے رہی ہے نہ مجھ میں، شاید وہ چاہتی تھی کہ میں چپ رہوں اور میں چپ ہو گیا تھا۔

وہ اتنی اہم نہیں تھی کہ میں اسے بار بار مخاطب کیے جاتا ہاں مشعل ہوتی تو معاملہ اور ہوتا مجھے اس کی خاموشی چبھتی تھی شاید میں نے اسے کبھی خاموش نہیں دیکھا تھا اس لیے۔

مشعل ہر معاملے میں اس سے بہت مختلف تھی۔ وہ بے حد خوبصورت تھی۔ دراز قد، سفید رنگت، خوبصورت بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جو دراز پلکوں سے سجی ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ ہر وقت مسکراہٹ کا تاثر لیے رہتا تھا۔ آنکھوں سے ہم رنگ اس کے سیاہ بال کمر تک لہراتے تھے وہ بہت کم ہی انھیں باندھتی تھی اور مہرین......

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر اپنے ذہن میں جیسے اس کے نقوش ابھارنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے چہرے میں کچھ بھی خالہ جیسا نہیں تھا، وہ بالکل اپنے باپ جیسی تھی۔ سانولی رنگت، عام سی آنکھیں، عام سے بال، معمولی شکل وصورت میں کوئی بھی تو ایسی خاص چیز نہیں تھی جو اسے کچھ بہتر کر دیتی پھر اس کی خاموشی، اس کی جلی کٹی باتیں اس کے کمپلیکسز واقعی کچھ لوگوں کو خدا کچھ بھی نہیں دیتا، پتا نہیں کیوں میں پھر اس کا موازنہ مشعل سے کرنے لگا تھا۔ کتنا مشکل ہوتا ہوگا اس کے لیے یونیورسٹی میں مشعل کا سامنا کرنا وہ جو مستقل لائم لائٹ میں رہتی تھی جو ہر چیز، ہر جگہ، ہر شخص پر چھا جاتی تھی پھر یہ سب مہرین کیسے برداشت کرتی ہوگی اس کی جیلسی حق بجانب ہے وہ اور کر بھی کیا سکتی ہے۔

مجھے مشعل پر فخر محسوس ہوا تھا۔ کیا کوئی اس سے زیادہ مکمل ہوگا؟ کسی کے پاس اس سے زیادہ نعمتیں ہوں گی؟ خوبصورتی، ذہانت، دولت، شہرت، محبت کیا نہیں تھا اس کے پاس اور وہ تو پھر اندر سے بھی خوب صورت تھی۔ اس میں غرور نہیں تھا۔ عاجزی تھی، نرمی، ایثار تھا سچائی تھی جو اس کے ہر لفظ میں بولتی تھی اور اس صاف گوئی نے ہی تو مجھے اس کا شیدا کیا تھا۔

اس کا گھر آ گیا تھا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ میں گاڑی سیدھی اندر لے گیا۔

''میں نے خالہ سے کہا تھا کہ میں خود چلی جاتی ہوں مگر انھوں نے خود ہی اصرار کیا تھا کہ آپ مجھے چھوڑ آئیں گے حالانکہ میں آپ کو زحمت نہیں دینا چاہتی تھی بہرحال آپ کا شکریہ آپ نے اتنی زحمت کی۔''

گاڑی کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے پتا نہیں کیوں صفائی پیش کی اس سے پیشتر کہ وہ دروازہ

کھول کر اتر جاتی میں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میں نے کوئی زحمت نہیں کی، تم میری کزن ہو اور پہلے بھی تو تمھیں میں ہی چھوڑ کر آتا تھا۔ تب تو تم نے کبھی ایسا کچھ نہیں کہا۔''

''پہلے کی بات اور تھی۔'' لاؤنج کا دروازہ کھول کر اچانک مشعل باہر آئی تھی۔ میں نے ہینڈل سے ہاتھ اٹھا دیا۔ مہرین دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ مشعل سیدھی میری طرف آئی تھی، بڑی بے تکلفی سے اس نے میری طرف والا دروازہ کھولا اور مہرین کو مخاطب کیا۔

''اچھا کیا مہرین تم کسی بہانے انھیں لائیں تو ورنہ یہ صاحب تو یہاں آنے پر تیار ہی نہیں ہوتے۔''

مہرین نے ایک نظر رک کر ہم دونوں کو دیکھا تھا اور پھر کچھ کہے بغیر اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''اب اندر آؤ تم بھی۔'' مشعل نے مجھے کہا تھا۔

''نہیں یار مجھے کچھ کام ہے، مجھے واپس جانا ہے، میں ایک دو دنوں تک چکر لگاؤں گا'' اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر باہر کھینچا۔

''مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے تمھارے ایک دو دن بعد کے چکر سے، تم ابھی اترو آخر میں نے بھی دوپہر کے لنچ کا قرض اتارنا ہے۔ اس وقت تو آرام سے چھوڑ کر چلے گئے تھے مگر اب میں جانے نہیں دوں گی اترو نیچے۔''

میں اس کی بات رد نہیں کر سکا اور مسکراتا ہوا نیچے اتر آیا۔ اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے میں اندر آ گیا تھا۔

''نانی امی کہاں ہیں؟'' میں نے اندر آ کر پوچھا تھا۔

''اپنے کمرے میں ہیں ملنا چاہتے ہو؟'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس کے ساتھ جب میں نانی کے کمرے میں داخل ہوا تو مہرین وہیں تھی ہمیں دیکھ کر وہ کمرے سے چلی گئی۔

''دیکھیں دادی امی آج آپ کے نواسے کو میں زبردستی پکڑ کر لائی ہوں ورنہ یہ تو آنے پر تیار ہی نہیں تھا۔'' مشعل نے جیسے میرا تعارف کروایا تھا۔ میں نانی امی کے پاس بیٹھ گیا۔ انھوں نے میرا ماتھا چوما۔

''ایک ڈیڑھ ماہ کے لیے آتے ہو اور اس میں بھی تمھاری شکل دیکھنے کے لیے پیغام بھجوانا پڑتا ہے۔'' میں ان کے شکوے پر شرمندہ ہو گیا تھا۔

''نہیں نانی امی بس مصروفیت ہی اتنی ہوتی ہے کہ کہیں آنے جانے کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔'' میں نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں بھئی بہت مصروف ہیں یہ۔ ہم جیسے فالتو لوگوں سے ملنے کے لیے وقت کہاں سے نکالیں؟ ان سے ملنا ہو تو باقاعدہ اپائنٹمنٹ لینی چاہیے کہ بھئی اگر فرصت ہے تو ایک نظر ہم غریبوں پر بھی۔''

مشعل کرسی پر جھولتے ہوئے کہہ رہی تھی میں اس کی بات پر صرف مسکرا کر رہ گیا۔

''جاؤ مشعل اسود کے لیے کچھ کھانے پینے کے لیے لے کر آؤ۔'' وہ نانی امی کی ہدایت پر سر ہلاتے ہوئے اٹھ گئی۔

''تمہاری ماں آئی تھی، کہہ رہی تھی کہ تم اگلے ہفتے جانے والے ہو۔''
نانی امی نے مجھ سے کہا۔
''ہاں چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں میری اس لیے۔''
''اتنی کم چھٹیاں لے کر کیوں آتے ہو؟''
''نانی یہ اتنی کم چھٹیاں بھی نہیں ہوتیں ایک ماہ گزار کر جا رہا ہوں اس سے زیادہ کیا رہوں؟''
''میں نے تو تمہاری ماں سے کہا ہے کہ اب تمہاری شادی کا سوچے، ماشاء اللہ اب تم اچھا خاصا کمانے لگے ہو۔ اس قابل ہو گئے ہو کہ بیوی بچوں کی ذمہ داری اٹھا سکو۔''
''ایسی بھی کیا جلدی ہے نانی ابھی تو مجھے آزاد رہنے دیں دو چار سال، پھر دیکھا جائے گا اور پھر میں کون سا بوڑھا ہو رہا ہوں؟''
''تمہاری ماں بھی یہی کہہ رہی تھی دونوں کا دماغ برابر خراب ہے۔''
وہ کچھ خفا سی ہو گئی تھیں۔
''آپ ناراض نہ ہوں، میں سوچوں گا اس بارے میں کچھ۔'' میں نے انھیں تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔
''پہلے تو آپ خاندان کی لڑکیوں کے بارے میں کچھ سوچیں۔''
''خاندان میں کون سی ڈھیروں ڈھیر لڑکیاں ہیں؟ ابرار کی بچیاں ہیں تو انھیں تو ابرار کی بیوی اپنے خاندان میں بیاہنے کا خیال رکھتی ہے اور اس کے خاندان والے بھی یہی چاہتے ہیں۔ اصغر اپنی دو بچیاں بیاہ چکا ہے اور تیسری کی باری آنے میں ابھی دیر ہے، باقی رہ گئی مشعل تو اس کے لیے تو رشتوں کے انبار لگے ہوئے ہیں ہر ہفتے ایک دو رشتے آ جاتے ہیں۔''
میں کچھ بے چین ہو گیا تھا۔
''کیا ماموں ممانی نے کہیں اس کے لیے کچھ سوچا ہے۔''
''ابھی تک تو نہیں، اکلوتی ہے نا اس لیے وہ اتنی جلدی شادی کرنا نہیں چاہ رہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تعلیم مکمل کر لے پھر ہی وہ کچھ سوچیں مگر اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، اس کے لیے تو اتنے رشتے ہیں کہ انھیں انتخاب کرنے میں دشواری ہو گی۔'' وہ بتا رہی تھیں۔
''اور مہرین بھی تو ہے اس کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے۔'' میرے سوال پر نانی اماں کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا۔ وہ یک دم چپ ہو گئیں۔
''اس کے بارے میں کیا سوچنا ہے اس نے تو صاف صاف کہہ دیا ہے کہ کسی کو اس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے جب اسے شادی کرنی ہو گی وہ بتا دے گی، کیا کیا جتن کر کے میں نے اس کے لیے ایک دو رشتے تلاش کیے تھے مگر اس نے تو صاف انکار کر دیا کہ مجھے ابھی شادی کرنی ہی نہیں ہے۔ بالکل باپ پر گئی ہے وہ، نہ اس میں کوئی لحاظ مروت تھا نہ اس میں ہے، بات کرتے ہوئے یہ بھی نہیں سوچتی کہ کس سے بات کر رہی ہے۔

میں نے پال پوس کر اسے جوان کیا ہے۔ سوچا تھا یتیم ہے لڑکی ذات ہے، اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں مگر کیا پتا تھا کہ جوان ہو کر وہ ایسی بدلحاظ ہو جائے گی۔ بچپن سے یہاں رہتی آئی ہے، یہاں کا کھاتی ہے مگر اب یہ عالم ہے کہ کسی سے بات کرنا تو ایک طرف سلام دعا تک کی زحمت گوارا نہیں کرتی۔ کوئی مرے کوئی جیے اس کی بلا سے، اسے تو پروا ہی نہیں ہے، ساری ساری رات کمرے کی لائٹ جلائے پتا نہیں کیا کرتی رہتی ہے اسے تو میرے پاس آ کر بیٹھنا پسند نہیں ہے حالانکہ یہ میں ہوں جس کی وجہ سے سب لوگ اسے برداشت کیے ہوئے ہیں ورنہ تو سب یہ چاہتے ہیں کہ اب اس کی ماں اسے لے جائے اور خود ہی اس کی شادی کرے مگر میں نے ان سے کہا ہے کہ جب اتنے سال اپنے پاس رکھا تو پھر دو چار سال اور سہی۔"

نانی اس کے ہاتھوں کافی تنگ تھیں اور اس کی یہ شکایتیں کوئی نئی بات نہیں تھی۔

"آپ اسے سمجھاتی کیوں نہیں ہیں؟"

"کیا سمجھاؤں میں اسے، وہ اب کوئی چھوٹی بچی تو نہیں ہے۔ آخر مشعل بھی تو ہے۔ اسے کون سمجھاتا ہے؟ اس کی ماں میں لاکھ برائیاں سہی مگر بیٹی کی تربیت اس نے اچھی کی ہے، مجال ہے کبھی کسی کو تکلیف پہنچی ہو اس سے یا کبھی وہ کسی سے لڑی ہو۔ اللہ نے صورت بھی خوب دی ہے اور سیرت بھی اور یہاں یہ حال ہے کہ نہ صورت اچھی ہے اور نہ سیرت اور لوگ خالی تعلیم کو نہیں دیکھتے، لڑکیوں کے گن دیکھتے ہیں اور اس میں تو اس قسم کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔"

"مہرین اچھی ہے، بہت اچھی ہے، دادی تو خوامخواہ ہی پریشان رہتی ہیں۔ جب اس کی شادی ہونی ہوگی تو پتا بھی نہیں چلے گا اور ہو جائے گی۔ کیونکہ رشتے تو آسمانوں پر لکھے ہوتے ہیں۔" مشعل اسی وقت اندر آئی تھی اور اس نے دادی کے آخری جملوں پر تبصرہ کیا تھا۔

"ایک یہ ہے دیکھو ہر وقت کیسے پیار سے اس کا تذکرہ کرتی ہے اور ایک وہ ہے کبھی جو میں مشعل کا نام لے لوں تو آگ ہی لگ جاتی ہے اسے۔"

"میرا نام ہی ایسا ہے دادی اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔" مشعل نے ہنس کر کہا تھا۔

"اب اس کا ذکر چھوڑیں کوئی اور بات کرتے ہیں۔" اس نے ٹرالی سے چائے کے برتن ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یعنی تمہارے بارے میں بات کریں۔" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں بالکل میرے بارے میں بھی بات ہو سکتی ہے۔ ویسے یہ کوئی compulsion نہیں ہے جس چیز کے بارے میں چاہیں بات کریں۔"

اس نے چائے کا کپ مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

پھر واقعی باتوں کا رخ مڑ گیا تھا۔ رات کا کھانا میں نے وہیں کھایا تھا۔ مہرین کے علاوہ ڈائننگ ٹیبل پر سب تھے گپ شپ کرتے میں نے اس ڈنر کو واقعی انجوائے کیا تھا، کھانے کے بعد دوبارہ چائے کا دور چلا تھا اور مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مشعل کی حس مزاح واقعی اچھی تھی، وہ لطیفے سنا رہی تھی اور پورا لِونگ روم قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ وہ بڑی

زبردست نقال تھی۔

رات کو گیارہ بجے کے قریب میں واپس گھر آیا تھا اور میرے دل و دماغ پر مشعل چھائی ہوئی تھی۔ اس کے ہونے سے ہر چیز بہت مکمل، بہت رنگین نظر آ رہی تھی میں سونے سے پہلے دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔

............❀............

''تمھارے گھر والے تمھارے لیے کوئی رشتہ وغیرہ تلاش کر رہے ہیں؟'' اگلے دن ہم دوبارہ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے تھے اور میں نے اس سے پوچھا تھا۔

''یہ افواہ تم نے کہاں سے سنی؟'' اس نے بڑے اطمینان سے جلفریزی لیتے ہوئے کہا۔

''نانی اماں نے بتایا ہے۔''

''اوہ کافی reliable سورسز ہیں تمھارے مگر انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ رشتے ڈھونڈے نہیں جا رہے خود آ رہے ہیں لیکن مجھے اور میرے ماں باپ کو کوئی جلدی نہیں ہے؟''

''نہیں، انھوں نے مجھے بتایا تھا مگر پھر بھی میں نے تم سے بات کرنا مناسب سمجھا۔ یاد رکھنا مشعل جب شادی کے بارے میں سوچو تو سب سے پہلے میرے بارے میں سوچنا۔''

میں نے اسے سنجیدگی سے کہا اس کے چہرے پر ایک خوبصورت مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کیا تم مجھے پرو پوز کر رہے ہو؟''

''ہاں میرا خیال ہے کہ میں یہی کہہ رہا ہوں۔''

''چلو سوچیں گے تمھارے بارے میں بھی۔''

اس نے اپنی پلیٹ میں سلاد ڈالتے ہوئے کہا۔

''بالکل تمھیں صرف میرے بارے میں ہی سوچنا ہے۔''

''کوئی زبردستی ہے؟'' اس کے چہرے پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔

''ہاں زبردستی ہی سمجھو۔''

''بھئی اگر پرو پوز کرنا ہے تو باقاعدہ ڈھنگ سے کرو'' اس نے سلاد کھاتے ہوئے کہا تھا۔

''باقاعدہ پرو پوز تب کروں گا جب پاکستان ٹرانسفر ہوں گا اس سے پہلے نہیں۔''

''پہلے کیوں نہیں؟''

''بس ویسے ہی میں یہ لمبی چوڑی منگنیوں پر یقین نہیں کرتا۔ جب پاکستان ٹرانسفر ہو جاؤں گا تو ایک ماہ پہلے منگنی کروں گا اور پھر شادی، یہ دو دو سال پہلے کی جانے والی منگنیوں میں بڑے چکر پڑتے ہیں۔ بڑے جھگڑے ہوتے ہیں اور میں یہ سب چیزیں نہیں چاہتا۔''

میں نے اسے اپنی بات سمجھائی تھی۔

''کافی دور کی سوچتے ہو تم۔'' وہ میری بات پر مسلسل مسکراتی رہی۔ میں بھی جواب دیے بغیر صرف مسکرا دیا۔

کچھ دیر ہم دونوں خاموشی سے کھانا کھاتے رہے پھر پتا نہیں کیسے مہرین موضوع گفتگو بن گئی اور ایسا اکثر ہی ہوتا تھا۔ مہرین کے لیے ہمیشہ ہماری گفتگو میں کچھ نہ کچھ گنجائش نکل آتی تھی۔ ہمیں پتا بھی نہیں چلتا تھا اور ہم اس کے بارے میں بات کر رہے ہوتے تھے۔

''تمھیں پتا ہے مہرین آج کل کیا کر رہی ہے؟''

اس نے اچانک مجھ سے کہا تھا میں اچانک کھانا کھاتے کھاتے رک گیا۔

''دادی امی اس کی وجہ سے پہلے ہی بہت پریشان رہتی ہیں مگر اب وہ جو کام کر رہی ہے اس کا انھیں پتا چل گیا تو گھر میں طوفان آ جائے گا۔ میں تمھیں بتانا نہیں چاہ رہی تھی مگر صرف اس لیے بتا رہی ہوں کہ تم دونوں کی اچھی خاصی دوستی ہوا کرتی تھی۔ شاید تم ہی اسے کچھ سمجھا سکو۔''

اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

''کیا کر رہی ہے وہ؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''آج کل یونیورسٹی میں اس کا افیئر بہت مشہور ہے۔ پچھلے کافی عرصہ سے وہ کئی لڑکوں کے ساتھ پھرتی رہی ہے مگر اب کافی عرصہ سے وہ ایک لڑکے کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ دونوں سارا دن کلاسز اٹینڈ کرنے کے بجائے یونیورسٹی کے لان میں بیٹھے رہتے ہیں یا پھر ہوٹلنگ کرتے رہتے ہیں۔ اس لڑکے کی شہرت بھی اچھی نہیں ہے مگر مہرین کو پتا نہیں اس میں کیا نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے بھی بہت پریشانی اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ آخر کو وہ میری کزن ہے اور یونیورسٹی میں یہ بات سب جانتے ہیں۔

میں نے ابھی تک یہ بات دادی سے چھپائی ہے حالانکہ وہ مجھے کہتی رہتی ہیں کہ میں مہرین کے بارے میں سب کچھ انھیں بتاتی رہوں مگر مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ میں اس کی جاسوسی کرتی پھروں، اس لیے میں دادی کے سامنے تو ''سب اچھا ہے'' کا ڈھونگ رچائے رکھتی ہوں مگر درحقیقت بہت پریشان ہوں۔ جلد یا بدیر یہ بات گھر تک پہنچ ہی جائے گی پھر وہاں ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔

مجھے مہرین کی فکر ہے اس کی پروا ہے مگر وہ یہ بات نہیں سمجھتی، پلیز تم ایک بار اس سلسلے میں اس سے بات ضرور کرو۔'' اس نے منت بھرے انداز میں کہا تھا۔

''لیکن مشعل میں اسے کیا کہوں گا اور پھر ہماری جو تھوڑی بہت دوستی تھی وہ اب نہیں ہے اب تو وہ مجھ سے زیادہ بات بھی نہیں کرتی۔'' میں نے اپنی پوزیشن واضح کی تھی۔

''پھر بھی اسود تم اس سے بات تو کرو۔''

''مشعل تم خود اس سے بات کیوں نہیں کرتیں؟''

''اسود وہ کبھی بھی میری بات پر عمل نہیں کرے گی وہ تو مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہے۔''

''ٹھیک ہے پھر تمھیں اس کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے جو آدمی غلطی کرے اسے ٹھوکر لگنی ہی چاہیے اگر اسے خود اپنی عزت کی پروا نہیں ہے تو تم یا میں اسے کیا سمجھائیں؟''

میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا مگر وہ میری بات پر بگڑ گئی تھی۔

''یعنی تمہارا مطلب ہے کہ ہم اسے کنویں میں گرنے دیں، کم از کم میں تو ایسا نہیں ہونے دوں گی اور مجھے تم سے بھی بڑی مایوسی ہوئی ہے اسود، میرا خیال تھا کہ تم اتنی خود غرضی نہیں دکھاؤ گے اور وہ بھی مہرین کے معاملے میں۔''

''ٹھیک ہے میں اس سے بات کروں گا۔'' میں نے ایک دم ہتھیار ڈال دیے تھے۔

وہ مہرین کے لیے واقعی پریشان تھی اور یہ پریشانی مجھے اچھی لگی تھی۔

''اور لوگ کہتے ہیں اب دنیا میں اچھے لوگ نہیں ہوتے۔'' میں نے کھانا شروع کرتے ہوئے سوچا تھا۔

............❀............

اگلے چند دن میں واپس جانے کی تیاریوں کے سلسلے میں مصروف رہا اور مہرین سے نہیں مل سکا۔ جس رات مجھے واپس لندن جانا تھا اس رات میں مشعل کے گھر گیا تھا۔ مشعل سے میں ایک دن پہلے ہی مل چکا تھا کیونکہ اسے اپنی خالہ کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے کوئٹہ جانا تھا۔

نانی اماں سے ملنے کے بعد میں نے ان سے مہرین کے بارے میں دریافت کیا تھا۔

''اپنے کمرے میں ہوگی اور اس کا کون سا ٹھکانہ ہے؟'' انھوں نے کہا۔

''پھر میں ذرا اس سے بھی مل آتا ہوں۔''

''ہاں جاؤ مل آؤ۔''

میں اوپر کی منزل پر چلا آیا۔ آہستہ سے میں نے اس کے دروازے پر دستک دی تھی۔ چند لمحوں تک خاموشی رہی پھر اس نے دروازہ کھول دیا تھا مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ سفید شلوار کرتے میں دوپٹے سے بے نیاز وہ کہنیوں تک آستینیں چڑھائے ہوئے خلاف معمول مجھے اچھی لگی تھی۔

''آئیں۔'' اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے اس نے مجھے اندر آنے کا راستہ دیا تھا میں اندر آ گیا۔

سادہ سا بے ترتیب کمرہ اس کی اپنی شخصیت کا عکاس تھا۔ کمرے میں ایک کارپٹ بچھا تھا اور اس پر کشن رکھے ہوئے تھے سائیڈ کی دیوار میں لگے ہوئے ریکس کتابوں سے بھرے ہوئے تھے، کارپٹ کے اوپر ایک کونے میں کچھ کتابیں پڑی ہوئی تھیں اور کچھ کاغذات اور فائلیں بھی تھیں۔ کمرے کے وسط میں رکھی ہوئی تپائی پر چائے کا ایک بھرا ہوا مگ پڑا تھا۔ دیواریں چھوٹی بڑی paintings سے سجی ہوئی تھیں۔ دیوار کے پاس رکھے ہوئے اسٹیریو میں بہت مدھم آواز میں کوئی انگلش سونگ بج رہا تھا۔ میں نے کمرے کا تفصیلی جائزہ لیا تھا۔

وہ اتنی دیر میں کشنز پر پڑا دوپٹہ اٹھا چکی تھی۔

''اچھا ہے تمہارا کمرہ، کافی عرصے بعد دیکھا ہے میں نے۔''

اس نے میرے تبصرے پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

''کیا بیٹھنے کے لیے نہیں کہو گی؟''

''بیٹھیں۔'' اس نے ایک کشن اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔

''میں آج واپس جا رہا ہوں سوچا کہ تم سے بھی ملتا چلوں۔''

کارپٹ پر بیٹھتے ہوئے میں نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ حیران ہوگی کیونکہ پہلے کبھی میں اسے خدا حافظ کہنے نہیں آیا تھا۔

میں نے اسے دیکھا تھا اور بہت اچانک ہم دونوں کی نظر ملی تھی۔ بہت عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اس کی نظر بہت اندر تک اتر جانے والی تھی۔ ایسی آنکھوں کو آپ آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتے۔

میں نے دوبارہ اس کی طرف نہیں دیکھا۔ میں جانتا تھا وہ مجھے دیکھ رہی ہے اور میں اس سے نظر نہیں ملا سکتا تھا۔

''کیا مصروفیات ہیں تمہاری؟'' میں نے بات شروع کرنے کی کوشش کی۔

''کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ وہی بات کریں جس کے لیے آپ آئے ہیں۔'' اس کا قیاس غضب کا تھا۔

''تم جانتی ہو میں کیا بات کرنے آیا ہوں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''مجھے غیب کا علم نہیں آتا۔'' اس نے بے تاثر انداز میں کہا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔

''مہرین ہم کبھی اچھے دوست ہوا کرتے تھے اور میں اب بھی تمھیں اچھا دوست ہی سمجھتا ہوں اسی لیے تمھیں ایک نصیحت کر رہا ہوں۔ ایسا کوئی کام مت کرو جس سے تمہاری عزت پر حرف آئے۔ تم بہت اچھی ہو اور میں چاہتا ہوں کہ سب تمھیں اچھا ہی سمجھیں۔''

''میں جانتی ہوں میں اچھی ہوں اور مجھے اپنی اچھائی ثابت کرنے کے لیے آپ کے یا کسی اور کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں ہے اور میں ایسا کوئی بھی کام نہیں کر رہی جس سے میری عزت پر حرف آئے۔'' اس کا انداز بہت پرسکون تھا۔

''اور یہ جو تم فضول قسم کے لڑکوں سے دوستی کیے ہوئے ہو وہ کیا ہے؟ کیا اس سے تمھیں کوئی فرق نہیں پڑتا؟'' میں نے بالآخر دوٹوک انداز میں بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر اس کے اطمینان میں رتی بھر کمی نہیں آئی وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر بولی۔

''ہر انسان کو حق ہے کہ وہ دوسروں کے بارے میں رائے دے، ضروری نہیں ہے جو آپ کو فضول لگے وہ مجھے بھی لگے اور مجھے لوگوں کی کافی پہچان ہے میں اتنی میچور ہو چکی ہوں کہ یہ طے کر لوں کہ کون اچھا ہے اور کون برا۔''

''لیکن لڑکوں سے دوستی کیا ضروری ہے؟''

''اگر لڑکوں سے دوستی ضروری نہیں ہے تو پھر آپ سے بھی دوستی نہیں ہونی چاہیے۔'' میں لاجواب ہو گیا تھا۔

''دیکھو اگر اس قسم کی کوئی خبر گھر پہنچ گئی تو تمھیں اس سے بہت نقصان ہو سکتا ہے۔'' میں نے اسے دھمکایا تھا۔ پہلی دفعہ اس کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے۔

''خبردار کرنے کے لیے شکریہ مگر اسود علی آپ میرے گارڈین ہیں نہ گاڈ فادر اور نہ ہی میں نے آپ سے کوئی مشورہ مانگا ہے، اس لیے آپ یہ مشورے اپنے پاس رکھیں۔ آپ ملنے کے لیے آئے آپ کا شکریہ Have a safe flight۔''

وہ صاف الفاظ میں مجھے جانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ میں کھڑا ہو گیا، اس سے زیادہ انسلٹ میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ کہے بغیر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

❁

اس رات پاکستان سے لندن کی فلائٹ میں، میں مہرین کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ جن لوگوں کو خود اپنی پروا نہیں ہوتی، کوئی دوسرا ان کے لیے کیا کر سکتا ہے؟ یہی غلطی اس کے باپ نے کی تھی۔ یہی غلطی وہ کر رہی تھی اچھا ہوا خالہ نے اس کے لیے اپنی زندگی برباد نہیں کی، میں نے سونے کے لیے آنکھیں بند کرتے ہوئے سوچا تھا۔

مشعل کو خط کے ذریعے میں نے اس سے ہونے والی بات چیت سے آگاہ کر دیا تھا مگر اسے بھی مجھ سے ہی شکایت تھی اسے لگتا تھا کہ میں نے اسے دل سے سمجھانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ مہرین کے بارے میں بہت پریشان رہتی تھی۔ اس کا ہر خط مہرین کے کسی نئے کارنامے کا تذکرہ ضرور لیے ہوئے ہوتا۔

فی الحال گھر والوں تک مہرین کی کوئی بات نہیں پہنچی تھی مگر اب میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے ابو کو مہرین کے بارے میں بتا دے۔ اس سے پہلے کہ پانی سر سے گزر جائے مگر اس کا جوابی خط جھڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ ''مجھے ایسا مشورہ دیتے ہوئے تمھیں شرم آنی چاہیے تم مہرین کی زندگی تباہ کرنا چاہتے ہو، تم مرد عورت کی کوئی غلطی کہاں چھپا سکتے ہو۔ تم چاہتے ہو میں اپنے ہاتھوں سے اس کے منہ پر سیاہی مل دوں۔''

خط میں اور بھی بہت کچھ تھا مگر مجھے اپنے مشورے پر کوئی شرمندگی نہیں ہوئی تھی۔ مشعل جذباتی ہو کر سوچ رہی تھی اور میں حقیقت پسند تھا سو میں نے امی کو فون کر کے پوری صورت حال بتا دی تھی مگر وہ تو اس بات پر یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھیں۔

''تمھیں اور مشعل کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے مہرین ایسی ہو ہی نہیں سکتی۔''

ان کی ایک ہی رٹ تھی۔ میں نے انھیں قائل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام ہو کر موضوع ہی بدل دیا۔

''ٹھیک ہے مجھے کیا میں کیوں اپنا وقت اور دماغ ضائع کروں جب نتیجہ ان کے سامنے آئے گا تو خود ہی انھیں پتا چل جائے گا کہ غلط فہمی کس کو تھی۔'' میں نے سوچا تھا۔

چار ماہ بعد اچانک میری پوسٹنگ پاکستان ہو گئی تھی۔ یہ بات خلاف توقع تھی مگر بہر حال میرے لیے خوشی کا باعث تھی کہ اتنی جلدی مجھے پاکستان ٹرانسفر کیا جا رہا ہے۔ میں کراچی آ گیا تھا کیونکہ مجھے کمپنی کے ہیڈ آفس میں کام کرنا تھا۔ میں نے اپنے آفس کا چارج لے لیا اور اپنے آپ کو کام میں الجھانا شروع کر دیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں نے اپنے عہدے کی ساری ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ لندن کی نسبت پاکستان میں کام کا پریشر زیادہ تھا۔ مجھے یہاں زیادہ کام کرنا پڑتا تھا اور رات گئے تک مگر پھر بھی میں تقریباً روز ہی امی اور مشعل سے بات کر لیا کرتا تھا اور یہ تو جیسے میری روٹین میں شامل ہو گیا تھا۔

میں ہر ویک اینڈ پر لاہور کا ایک چکر ضرور لگا لیا کرتا تھا۔ ابھی تک میرا قیام ایک ہوٹل میں تھا اور کمپنی کی طرف سے مجھے ابھی باقاعدہ رہائش گاہ نہیں ملی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ رہائش گاہ ملتے ہی میں امی کو بھی اپنے ساتھ کراچی

لے جاؤں گا۔ ان کی تنہائی بھی دور ہو جائے گی امی نے کراچی شفٹ ہونے کی تیاریاں بھی شروع کر دی تھیں۔

ایک شام جب میں نے امی کو فون کیا تو رسمی اور معمول کی بات چیت کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا تھا۔

''اسود آج مجھے تم سے بہت اہم اور ضروری بات کرنی ہے اس لیے تم میری بات غور سے سننا۔''

''امی میں آپ کی ہر بات غور سے سنتا ہوں آپ اس معاملے میں فکر نہ کریں اور بات کریں۔''

مجھے تب تک اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی ہیں۔ مگر ان کے اگلے جملے نے مجھے ہکا بکا کر دیا تھا۔

''میں امی سے تمھارے لیے مہرین کا رشتہ مانگنے والی ہوں۔''

''امی آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' میرے سر پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں شروع سے ہی میرا ارادہ تھا کہ میں مہرین کو اپنی بہو بناؤں مگر میں چاہتی تھی کہ تم کسی قابل ہو جاؤ تو میں ایسا کچھ کروں اور اب تم اس قابل ہو گئے ہو اور مہرین کی تعلیم بھی مکمل ہونے والی ہے۔''

''امی میں اسے قطعاً پسند نہیں کرتا اور نہ ہی میں نے کبھی اس کے بارے میں ایسا کچھ سوچا ہے وہ میرے لیے ایک کزن ہے اور بس، میری بیوی کے معیار پر وہ پوری نہیں اترتی۔''

میں نے صاف اور سیدھے لفظوں میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ کچھ دیر تک دوسری طرف خاموشی چھائی رہی پھر امی نے کہا تھا۔

''بچپن میں تو تمہاری بڑی دوستی ہوتی تھی اس سے۔''

''بچپن کی بات بچپن کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اب ہمارے درمیان اس قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''مگر اس میں خرابی کیا ہے؟''

''آپ مجھے یہ بتائیں کہ اس میں اچھائی کیا ہے؟ مجھے بطور بیوی ایسی لڑکی چاہیے جو صاف گو، اور مضبوط کردار کی مالک ہو۔ جو کھلے دل اور اعلیٰ ظرف کی مالک ہو، جو سمجھدار ہو، جس کے ساتھ میری اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو اور معاف کیجیے گا آپ کی بھانجی میں ان میں سے ایک بھی کوالٹی نہیں ہے۔

مجھے یہ بات کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے مگر یہ سچ ہے کہ وہ ایک برے کردار کی لڑکی ہے۔ جس کی نہ خاندان کے باہر عزت ہے نہ خاندان میں اور آپ پتا نہیں کس جرم کی سزا کے طور پر اسے میرے سر پر تھوپنا چاہ رہی ہیں۔'' امی نے میری بات سننے کے بعد کہا تھا۔

''تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، تمھیں بہت سی غلط فہمیاں ہیں اس کے بارے میں، تمھیں پتا ہی نہیں ہے کہ اس کے لیے کیسے کیسے رشتے آرہے ہیں تم تو ان کے سامنے کچھ بھی نہیں ہو یہ تو میں ہوں جو ضد کر رہی ہوں کہ اس کی شادی تم سے ہو اور وہ میرے گھر آئے ورنہ امی تو اس کا رشتہ طے کرنے والی ہیں۔''

مجھے امی کی غلط بیانی پر ہنسی آئی تھی۔ وہ اگر یہ جانتی ہوتیں کہ نانی امی مہرین کے لیے رشتوں کی کمیابی کے رونے میرے آگے رو چکی ہیں تو وہ شاید کبھی بھی یہ جھوٹ نہ بولتیں۔

''ٹھیک ہے اگر اس کے لیے اچھے رشتے ہیں تو مسئلہ ہی کیا ہے۔ آپ نانی امی کو کہیں کہ وہ کوئی بھی اچھا رشتہ اس کے لیے منتخب کرلیں مگر میرا پیچھا چھوڑ دیں میں نے اس سے شادی نہیں کرنی۔ مجھے اپنی مرضی سے شادی کرنی ہے۔''

''ٹھیک ہے پھر جہاں تمہارا دل چاہے شادی کرلو میرا تمہارا رشتہ آج سے ختم سمجھو۔'' انھوں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا، میں ان کی اس حرکت پر حیران ہو گیا تھا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس رشتے کو اتنا سنجیدگی سے لے رہی ہیں۔ مجھے مہرین پر بے تحاشا غصہ آیا تھا۔

پھر میں نے بار بار امی کو فون کیا ہر دفعہ بیل بجتی رہی مگر کسی نے فون نہیں اٹھایا شاید وہ بھی جانتی تھیں کہ میں دوبارہ فون ضرور کروں گا۔ بیس پچیس بار رنگ کرنے کے بعد میں نے تنگ آ کر فون بند کر دیا تھا وہ جانتی تھیں کہ میں انھیں رنگ کر رہا ہوں گا اسی لیے وہ فون نہیں اٹھا رہی تھیں یہ ایموشنل بلیک میلنگ تھی۔

میں نے کچھ دیر بعد مشعل کو فون کیا تھا اور اسے ساری بات بتائی تھی وہ سارا قصہ سن کر سکتے میں آ گئی تھی۔ چند منٹ خاموش رہنے کے بعد یک دم اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

''مشعل دیکھو تم پریشان مت ہو، کچھ نہیں ہوگا، میں امی کو رضا مند کرلوں گا مگر پلیز تم رونا بند کر دو۔'' میں بے حد پریشان ہو گیا تھا یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس طرح میرے سامنے روئی تھی۔

''پلیز اسود کچھ کرو، میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، میں مر جاؤں گی۔ خدا کے لیے کچھ کرو۔'' وہ بلکتے ہوئے کہہ رہی تھی اور میرا دل کٹ رہا تھا۔

پہلی دفعہ وہ اظہار محبت کر رہی تھی اور وہ بھی کس انداز میں۔

''مشعل کیا تمھیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے، تم فکر نہ کرو میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں اور انھیں میری خواہش کا احترام کرنا پڑے گا۔ وہ اگر رضا مند نہ بھی ہوئیں تو بھی میں اپنی زندگی کے فیصلے خود کروں گا۔'' میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

''میں مہرین کو سب کچھ دے سکتی ہوں سب کچھ مگر تمھیں نہیں۔ یہ واحد چیز ہے جس سے میں کسی صورت دستبردار نہیں ہو سکتی۔ تم میرے ہو اور میرے ہی رہو گے، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا بولو تم سن رہے ہو نا؟''

وہ بے تاب تھی اور میری کوئی تسلی اسے پُرسکون نہیں کر رہی تھی پھر بھی میں بہت دیر تک اسے دلاسے دیتا رہا اور جب وہ کچھ نارمل ہوئی تو میں نے فون بند کر دیا۔ مجھے امی پر بے تحاشا طیش آ رہا تھا۔ وہ پتا نہیں میرے کس گناہ کی سزا مجھے دینا چاہ رہی تھیں۔ میں پوری رات غصے سے کھولتا جاگتا رہا۔

اگلی صبح آفس سے چھٹی منظور کروانے کے بعد میں شام کی فلائٹ سے لاہور پہنچ گیا تھا۔ امی نے بڑی سرد مہری سے میرا استقبال کیا تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ میں آج ضرور آؤں گا۔ ایسی قیامت کسی کے سر پر توڑی جائے تو وہ ایک جگہ کہاں ٹک کر رہ سکتا ہے۔ میں آتے ہی امی سے بحث میں اُلجھ گیا تھا۔ وہ اپنی بات پر قائم تھیں اور قول سے پھرنے والا میں بھی نہیں تھا۔

''اسود دیکھو مہرین نے بہت مشکلات دیکھی ہیں، کہیں اور بیاہ کر جائے تو پتا نہیں اس کا نصیب کیسا ہو مگر اپنے گھر بیاہ کر

لاتے ہوئے مجھے یہ تسلی تو ہوگی کہ وہ سکھی رہے گی۔'' انھوں نے مجھے کہا تھا۔

''اس نے اگر مشکلات دیکھی ہیں تو اپنے باپ کی وجہ سے، نہ اس کا باپ ایسے کارنامے کرتا نہ اس کے اعمال اس کی بیٹی کے سامنے آتے مگر آپ مجھے کس گناہ کی سزا دے رہی ہیں۔ میں نے کوئی دارالامان تو نہیں کھولا کہ دوسروں کے سکھ کے لیے اپنی زندگی برباد کر دوں۔ ویسے بھی وہ اپنے باپ کی طرح ہی ہے، خودغرض اور بے حس اس لیے آپ کو اس کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، ایسے لوگ اپنی پروا کرنا خوب جانتے ہیں اور یہ بات میں آپ کو صاف صاف بتا دوں کہ اگر میرے ساتھ اس کی شادی ہو بھی گئی تو جان لیجئے گا کہ مجھ سے اسے کوئی خوشی نہیں ملے گی یہ بات تو طے ہے۔

ہوسکتا ہے کہیں اور شادی کر کے وہ خوشحال زندگی گزارے مگر میرے ساتھ شادی کر کے وہ بھی پچھتائے گی اور آپ بھی۔ مجھے وہ قطعاً پسند نہیں ہے۔''

''تو پھر تمھیں کون پسند ہے؟''

''مجھے مشعل پسند ہے اور آپ میرے لیے اس کا رشتہ مانگیں مہرین کا نہیں۔''

امی میری بات پر حیران رہ گئی تھیں۔

''مشعل...... مشعل......'' وہ زیرلب بڑبڑائی تھیں۔ پھر انھوں نے کہا تھا۔

''مشعل اچھی ہے مگر مہرین اس سے۔'' میں نے ان کی بات کاٹ دی۔

''میرے سامنے آپ مہرین کا نام بھی نہ لیں جب بھی آپ اس کا ذکر کرتی ہیں، اس سے میری نفرت اور بڑھ جاتی ہے۔''

''تم اس کے بارے میں بہت غلط سوچتے ہو، وہ ویسی نہیں ہے جیسی تم سمجھتے ہو۔''

''میں اسے کچھ سمجھتا ہی نہیں اور مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ وہ کیسی ہے اور کیسی نہیں، مجھے بس اس سے شادی نہیں کرنی اور بس۔''

''ٹھیک ہے اگر تمھیں اس سے شادی نہیں کرنی تو جو چاہے کرو، جس سے چاہو شادی کرو مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' انھوں نے خفگی سے کہا۔

''امی آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں؟ مہرین ایک بہت مکار اور چالباز لڑکی ہے آپ اسے بہو بنا کر پچھتائیں گی۔''

''تمہارا دماغ خراب ہے جو تم اس طرح کہہ رہے ہو۔''

''امی آپ سمجھتی کیوں نہیں جو لڑکی مجھے پسند نہیں ہے اس سے میں شادی کیسے کر سکتا ہوں؟ جس کے ساتھ ایک دن گزارنا مجھے مشکل لگتا ہے اس کے ساتھ ساری زندگی کیسے گزار سکتا ہوں؟'' میں نے بے چارگی سے کہا تھا۔

''تمھیں کوئی مجبور نہیں کر رہا، جہاں چاہے شادی کرنا اور جب چاہے کر لینا۔ میری طرف سے تمھیں اجازت ہے۔''

''امی مشعل بھی تو آپ کی بھتیجی ہے اور وہ ہر لحاظ سے مہرین سے بہتر ہے۔ پھر آپ اس قدر ضد کیوں کر

رہی ہیں؟ میں کوئی ایسی بات تو نہیں کر رہا جو نامناسب ہو بہر حال یہ تو طے ہے کہ میں اس سے شادی نہیں کروں گا، چاہے آپ ناراض ہی کیوں نہ ہوں اور اگر آپ کی یہ ناراضگی زیادہ دیر تک رہی تو میں واپس لندن چلا جاؤں گا اور وہیں شادی کرلوں گا اور دوبارہ کبھی آپ کو شکل نہیں دکھاؤں گا۔''

میں نے انھیں دھمکی دی تھی اور پھر میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

مجھے امی کی ناراضگی کی زیادہ پروا نہیں تھی اس مرحلے پر میں ان کی پروا کر کے اپنی زندگی خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے مشعل کی فکر تھی۔ پتا نہیں وہ کس قدر پریشان ہوگی۔ میں نے اسے رنگ کیا اور اپنی آمد اور امی کے ساتھ گفتگو کے بارے میں بتایا، وہ واقعی بہت پریشان تھی۔

''اسود اب کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں ہوگا، وہ کچھ دیر ناراض رہیں گی اور پھر مان جائیں گی ان کے کون سے دو چار بیٹے ہیں کہ ایک کو خفا کر دیں تو بھی انھیں کوئی فرق نہ پڑے، تم بس پریشان نہ ہو اور مجھ پر بھروسا رکھو۔''

میں نے اسے تسلی دی تھی پھر کافی دیر تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔

اگلی دوپہر کو میں امی کو خدا حافظ کہے بغیر واپس کراچی آ گیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ امی کی ناراضگی زیادہ دیر تک نہیں چلے گی اور اب میں ان سے ناراض رہنا چاہتا تھا تا کہ انھیں اپنے غلط رویے کا احساس ہو۔ اس دن میں نے امی کو فون نہیں کیا اور نہ ہی اس سے اگلے دن، البتہ میں مشعل کو فون کرتا رہا، وہ اب پہلے کی طرح فکر مند نہیں تھی البتہ وہ اس بات پر شرمندہ اور پشیمان ضرور تھی کہ میں نے اس کی وجہ سے اپنی امی کو ناراض کیا۔

تیسرے دن میں صبح آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا جب لاہور سے ماموں کی کال آئی، امی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور وہ ہاسپٹل میں تھیں مجھے لگا جیسے زمین ہل گئی تھی۔

''یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔'' پہلی سوچ یہی میرے دماغ میں آئی تھی۔

امی کو دل کی تکلیف کافی عرصے سے تھی مگر ان کی حالت کبھی اتنی خراب نہیں ہوئی تھی کہ انھیں ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑتا۔ یک دم ہر چیز سے میری دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ پہلی فلائٹ سے میں شام کو لاہور پہنچ گیا تھا اور ایئر پورٹ سے سیدھا ہاسپٹل گیا۔

امی اب ICU سے باہر تھیں مگر ان کی حالت بہت اچھی نہیں تھی۔ تینوں ماموں ہاسپٹل ہی میں تھے۔ میں امی کے کمرے میں گیا تھا، انھیں ڈرپ لگی ہوئی تھی اور وہ غنودگی کے عالم میں تھیں۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا مگر انھوں نے آنکھیں نہیں کھولیں وہ اسی طرح بے حس و حرکت رہیں۔ پتا نہیں میں کتنی دیر تک ان کا ہاتھ پکڑے اسی طرح بیٹھا رہا۔ کوئی ڈاکٹر میرے پاس آیا تھا اور اس نے مجھے کمرے سے باہر جانے کے لیے کہا۔ میں ایک معمول کی طرح چل کر باہر آ گیا۔

''پتا نہیں اسے ہوا کیا ہے اچھی بھلی تھی۔ چند دن پہلے ہی تو ہماری طرف آئی ہوئی تھی، بالکل ٹھیک تھی۔'' ماموں نے مجھے دیکھ کر کہا تھا۔

میں نے مشعل کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے بے تحاشا خوف نظر آیا، میں جانتا تھا وہ کیوں خوفزدہ ہے؟ وہاں وہ بھی تھی۔ وزیٹرز روم کے ایک کونے میں کرسی پر بیٹھی وہ بہت مطمئن نظر آ رہی تھی۔ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا تھا۔ نہ وہ ہوتی نہ امی مجھے اس سے شادی کے لیے مجبور کرتیں ہر چیز ٹھیک رہتی۔ مگر سب کچھ اس نے خراب کیا تھا اس کا باپ بھی یہی کرتا تھا۔ دوسروں کی زندگی اپنی حرکتوں سے خراب کرتا تھا وہ بھی یہی کر رہی تھی، یہ چیز اس کے خون میں شامل تھی اور امی وہ کچھ سمجھ ہی نہیں پا رہی تھیں۔ پتا نہیں اس نے ان پر کیا جادو کر دیا تھا۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ سب لوگ وہاں سے چلے گئے تھے مگر میں نہیں گیا۔ میں وہاں بیٹھا دیر تک امی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس رات وہ نیند آور دوائیوں کے زیر اثر سوتی رہیں مگر اگلی صبح وہ جاگ گئی تھیں میں ان کے پاس گیا، انھوں نے مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ میرے دل پر گھونسہ سا پڑا، تو میں ہی ان کی اس حالت کا ذمہ دار تھا۔ میں ان کے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ انھوں نے آنکھیں بند کر لیں میں نے ان کا ہاتھ پکڑا، انھوں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ میں نے ان کا حال پوچھا انھوں نے جواب نہیں دیا۔ میں پھر بھی وہیں بیٹھا رہا۔

کافی دیر تک ڈھیٹوں کی طرح وہاں بیٹھے رہنے کے بعد میں کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ پھر میں باہر لان میں ایک بینچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اگر مسئلہ مہرین کا نہ ہوتا تو میں امی کی ضد پر ہتھیار ڈال دیتا اور مشعل سے بھی دست بردار ہو جاتا مگر میں مہرین کو برداشت نہیں کر سکتا تھا، پچھلے کچھ عرصے سے جو نفرت مجھے اس سے ہو گئی تھی وہ اب میرے دل سے ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ پتا نہیں میں اسے اتنا ناپسند کیوں کرنے لگا تھا؟ وجہ جو بھی تھی بہر حال میں اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا اور پھر میں نے دو تین دن بعد امی کی حالت مزید سنبھلنے کے بعد ان سے یہی کہا تھا کہ وہ جس سے چاہیں میری شادی کر دیں مگر مہرین سے نہیں مگر انھوں نے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا، مجھے لگا وہ میری بات پر سوچ رہی ہیں۔

ایک ہفتہ کے بعد امی گھر آ گئی تھیں۔ ممانی نے مشعل کو ہمارے گھر بھیج دیا تھا اور وہی امی کی تیمار داری کر رہی تھی، امی کو گھر لانے کے دوسرے دن میں واپس کراچی آ گیا تھا اور میں نے رہائش حاصل کرنے کے لیے کوششیں تیز کر دی تھیں۔

ایک ہفتہ کے اندر اندر گھر حاصل کرنے کے بعد میں واپس لاہور گیا تھا اور امی کو کراچی لے آیا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ امی نے کراچی جانے کے خلاف مزاحمت نہیں کی اور یہ بات مجھے بہت عجیب لگی تھی مگر میں خوش تھا کہ بہر حال وہ میرے ساتھ آ گئی ہیں۔ امی کی بیماری کے بعد سے میں نے مشعل سے شادی کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی اس نے مجھ سے اس سلسلے میں کوئی بات کرنے کی کوشش کی۔

ہم لوگوں کے درمیان ایک عجیب سی دیوار حائل ہو گئی تھی اور میں اس دیوار کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اسے کوئی فریب دینا نہیں چاہتا تھا۔ میرے جیسے بندے کو عشق نہیں کرنا چاہیے۔ میں کمزور نہیں تھا مگر امی نے مجھے کمزور کر دیا تھا۔ میں انھیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ سو میں نے مشعل نام کی خواہش کو مار دیا تھا۔

کراچی آ کر امی کا رویہ بہت عجیب ہو گیا تھا، وہ بالکل چپ ہو کر رہ گئی تھیں۔ ہر چیز میں ان کی دلچسپی جیسے

ختم ہو گئی تھی۔ میری ہر بات کا جواب وہ صرف ہوں ہاں سے دیتی تھیں۔ میں بے حد پریشان تھا، میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں کہ وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں۔ انھیں اب میرا اپنے پاس بیٹھنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں شام کو آفس سے آ کر ان کے پاس بیٹھنا چاہتا تو وہ سونے کے لیے لیٹ جاتیں۔ میں ان کے لیے کوئی چیز خرید کر لاتا تو وہ اسے یونہی رکھ دیتیں۔ چھٹی کے دن وہ صرف میری وجہ سے اپنے کمرے سے نہیں نکلتی تھیں۔

اور ایک دن میں نے انھیں روتے ہوئے دیکھ لیا۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے مگر مجھے ایسا لگا تھا کہ میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔

''آپ کیا چاہتی ہیں، مجھے بتائیں آپ کیا چاہتی ہیں، آپ اس طرح کیوں کر رہی ہیں میرے ساتھ؟''

انھوں نے میری بات کا جواب نہیں دیا بس چپ بیٹھی رہیں۔

''آپ مہرین سے میری شادی کرنا چاہتی ہیں، کر دیں مگر خدا کے لیے یہ سب مت کریں جو آپ کر رہی ہیں۔''

انھوں نے حیرانگی سے مجھے دیکھا تھا مگر میں اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ جو فیصلہ اتنے بہت سے دنوں سے میں نہیں کر پایا تھا، وہ ایک لمحہ میں ہو گیا تھا جب اپنی خوشی نہیں تو ٹھیک ہے امی کی خوشی ہی سہی۔ اگر زندگی مشعل کے بغیر ہی گزارنی تھی تو پھر ٹھیک ہے جو بھی ہوتا اس سے کیا فرق پڑتا ہاں مہرین کے ہونے سے امی کو فرق پڑتا تھا۔

میں ایک دفعہ مشعل سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں ایک دفعہ اسے اپنی مجبوریاں بتانا چاہتا تھا۔ وہی روایتی مجبوریاں جن کا میں چند سال پہلے تک مذاق اڑاتا تھا۔ میں ایک دفعہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں نے صرف اس سے محبت کی تھی۔ اسود علی کو صرف اس نے جیتا تھا صرف اس نے تسخیر کیا تھا۔ وہ میری زندگی میں بے شک نہیں رہے گی مگر دل میں صرف وہی رہے گی۔

''مرد کے لیے بہت آسان ہوتا ہے کسی کو چھوڑنا۔'' اس نے ایک بار مجھ سے کہا تھا اور میں نے اس سے کہا تھا۔

''ہوتا ہو گا آسان کسی کو چھوڑنا مگر تمھیں نہیں۔'' اور اب میں اسے چھوڑ رہا تھا مشعل کو ترک کر رہا تھا۔ اور جب میں اس کے پاس نہیں رہوں گا تو باقی کیا بچے گا؟ اور جب وہ میرے پاس نہیں رہے گی تو میں کیا ہوں گا؟ اور اب اس کی خوبصورت آنکھوں میں بھی ہر وقت نمی تیرتی رہے گی اور اب وہ بھی لوگوں پر اعتماد کرنا چھوڑ دے گی۔

''میں دوسروں کے لیے اتنا ایثار اور اتنا کچھ کرتی ہوں کہ مجھے نہیں لگتا خدا مجھے اپنی آنے والی زندگی میں کسی کے ہاتھوں فریب دلوائے گا۔''

ایک بار چمکتی آنکھوں کے ساتھ اس نے مجھ سے کہا تھا اور اب اس کی ساری قربانی اور سارا ایثار دھرا رہ جائے گا۔

میں نے اسے فون کیا تھا اور مجھے اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ جیسے سب جانتی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیسے بات شروع کروں؟ سو میں چپ تھا اور اس کے پاس شاید کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔

''مشعل میں مہرین سے شادی کر رہا ہوں۔'' بہت دیر چپ رہنے کے بعد میں نے کہا تھا۔ دوسری طرف خاموشی رہی۔

''میں مجبور ہوں مشعل میں اپنی ماں کو کھونا نہیں چاہتا۔''

''اور مجھے...... مجھے کھو دو گے۔'' اس کی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز گونجی تھی۔

''مجھے ایسا کرنا پڑے گا اس کے علاوہ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہے۔''

''ہاں اس کے علاوہ تمھارے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے مگر ایک بات یاد رکھنا تم بھی اتنے سچے اور بہادر نہیں ہو جتنا تم دعویٰ کرتے رہے ہو تم بھی عام سے مرد ہو جو صرف اسٹیئر چلانا جانتا ہے اور شادی کے وقت اسے اپنی مجبوریاں یاد آنے لگتی ہیں میرا کیا ہے میں تو زندگی گزار لوں گی مگر تم کیا کرو گے خود کو اور مہرین کو دھوکا دے کر کیسے رہو گے اسود؟''

''میں واقعی اب اتنا سچا اور بہادر نہیں رہا اور ابھی تو مجھے خود کو اور دوسروں کو بہت فریب دینے ہیں، لیکن میں نے تمھیں کوئی دھوکا نہیں دیا پتا نہیں سب کچھ کیسے ہو رہا ہے؟ میرے اختیار میں کچھ باقی رہا ہی نہیں۔''

وہ رو رہی تھی، میں اسے چپ نہیں کروا سکتا تھا میں اسے چپ کروانا چاہتا بھی نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے اسود جو چاہتے ہو کر لو مگر تم یاد رکھنا کہ میں نے تم سے بہت محبت کی تھی۔ میں نے تمھیں اتنا چاہا ہے کہ کوئی اور تمھیں کبھی اتنا نہیں چاہے گا، مہرین بھی نہیں، تمہاری اولاد بھی نہیں، تم نے مہرین کا انتخاب کیا ہے تو ٹھیک ہے مہرین ہی سہی، نہ تم اس پر اپنا ماضی ظاہر کر سکو گے نہ وہ، مگر وہ بھی تمھارے اور میرے بارے میں جانتی ہے اور تم بھی اس کے بارے میں جانتے ہو پھر بھی اگر دونوں ساتھ رہنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے میری دعا ہے کہ تم دونوں خوش رہو بہت خوش رہو حالانکہ تم نے کسی کو برباد کر دیا ہے۔''

اس نے فون بند کر دیا تھا۔ میں بہت دیر تک ریسیور ہاتھ میں تھامے بیٹھا رہا جیسے ابھی اس کی آواز اس میں گونج اٹھے گی، جیسے ابھی وہ کہے گی کہ وہ خوش ہے، وہ ہنس رہی ہے۔ مگر میں جانتا تھا کہ اس وقت وہ شاید دھاڑیں مار مار کر رو رہی ہوگی اور خوش تو اب شاید وہ ساری زندگی نہ ہو۔

مشعل کو واقعی میں نے برباد کر دیا تھا۔ اسے رونا نہیں آتا تھا اور اب میں نے مستقل طور پر اس کی آنکھوں میں آنسو سجا دیے تھے۔ وہ ہر لحاظ سے مکمل تھی اور میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ادھورا کر دیا تھا۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم جسے سب کچھ دے دینا چاہتے ہیں اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہنے دیتے؟ اور میں اور مشعل اب ساری زندگی ایک دوسرے کو لوگوں کے چہروں میں تلاش کرتے پھریں گے، اور مہرین وہ کیسے ہم دونوں کے درمیان آ گئی تھی۔ ہم لوگوں نے تو اس کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی تھی، ہم دونوں نے تو ہمیشہ اس کا بھلا ہی چاہا تھا پھر بھی۔

............❀............

زندگی یک دم بدل گئی تھی، امی لاہور گئی تھیں اور پندرہ دن وہاں رہنے کے بعد جب وہ واپس آئی تھیں تو مہرین اور میں ایک دوسرے سے منسوب ہو چکے تھے۔ وہ بہت خوش تھیں۔ ان کی ساری اداسی، ساری پریشانی ختم ہو چکی تھی اور میں ان پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا کہ میں مطمئن ہوں۔ اپنی اداسی ظاہر کرنے کا فائدہ بھی کیا تھا؟ جب قربانی دے رہا تھا تو پھر دل سے دینا چاہتا تھا۔

وہ مجھے مہرین کے بارے میں بتاتی رہتی تھیں، وہ ایسی تھی، وہ یہ کہہ رہی تھی، میں نے اسے یوں کہا، میں

اسے وہاں لے کر گئی۔ ایک بار بھی ان کی زبان پر مشعل کا نام نہیں آیا حالانکہ میں پوچھنا چاہ رہا تھا کہ وہ کیسی تھی؟ منگنی کی تصویروں میں مہرین کے ساتھ بیٹھی وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی اور مہرین کے چہرے پر مسکراہٹ کا نام ونشان نہیں تھا اسے خوش ہونا چاہیے تھا، اس نے مشعل سے مجھ کو چھین لیا تھا اور مشعل...... سو وہ اب دنیا کو دھوکا دینا سیکھ رہی تھی، اپنی مسکراہٹ سے وہ مجھے اور سب کو یہ دکھانا چاہتی تھی کہ وہ خوش ہے اسے کوئی دکھ نہیں ہے۔

میں ان تصویروں میں صرف مشعل کو دیکھتا رہا تھا، وہ سب سے منفرد سب سے ممتاز نظر آتی تھی اور واقعی وہ ایسی تھی۔

اس دوپہر امی نے مجھے آفس فون کیا تھا مجھے ان کی آواز سے اندازہ ہوگیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے مگر میرے اصرار پر بھی انہوں نے مجھے نہیں بتایا کہ معاملہ کیا ہے بس وہ مجھے یہی کہتی رہیں کہ میں آفس سے لاہور جانے کے لیے چھٹی لے کر گھر آ جاؤں پھر وہ مجھے سب کچھ بتا دیں گی۔

میں انتہائی پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا امی کا چہرہ دیکھ کر میں دھک سے رہ گیا تھا ان کی آنکھیں رو رو کر سوج چکی تھیں۔

"مشعل کی طبیعت خراب ہے اسے ہاسپٹل لے کر گئے ہیں۔"

انہوں نے میرا دل دہلا دیا تھا مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ ان سے کچھ اور پوچھتا، میں فون اٹھا کر لاہور جانے کے لیے سیٹوں کی بکنگ کے انتظامات میں لگ گیا تھا، امی بس روئے جا رہی تھیں اور چپ ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھیں میں جانتا تھا یہ پچھتاوے کے آنسو تھے انہیں بہنا ہی چاہیے تھا اس لیے میں نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔

فلائٹ میں بیٹھے ہوئے بھی ہم دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی بس ایک خاموشی تھی جو ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ پتا نہیں امی کیا سوچ رہی تھیں مگر میں، میں تو صرف اس کے لیے دعائیں کر رہا تھا میں جانتا تھا اسے ہاسپٹل میں پہنچانے والا میں ہی تھا ورنہ مشعل کو کیا ہو سکتا تھا۔

لاہور ایئرپورٹ پر اتر کر امی کے آنسوؤں میں اور روانی آ گئی تھی۔ شاید وہ سوچتی ہوں گی کہ وہ کس منہ سے مشعل کا سامنا کریں گی آخر وہ بھی تو اس کی اس حالت کی ذمہ دار تھیں نہ وہ ضد کرتیں نہ مہرین سے میری منگنی ہوتی اور نہ مشعل کی یہ حالت ہوتی۔

اس وقت شام کے چھ بجے تھے جب ہم لاہور پہنچے تھے ایئرپورٹ سے ٹیکسی لے کر ہم مشعل کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے تھے امی کی سسکیاں پہلے سے بڑھ گئی تھیں اور میں اب بھی خود پر قابو رکھے ہوئے تھا۔

آخر مرد تھا رو تو نہیں سکتا تھا ہاں مگر جوں جوں ٹیکسی اس کے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں اور پھر ایک موڑ مڑتے ہی اس کا گھر سامنے آ گیا تھا، اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اس کے گھر کے سامنے سڑک پر گاڑیوں کی لمبی قطار نظر آ رہی تھی۔ اور جا بجا لوگ بھی تھے۔ اور یک دم میرے ساتھ بیٹھی ہوئی امی ہچکیاں لے کر بلند آواز میں رونے لگی تھیں۔

میں نے وحشت بھری نظروں سے انہیں دیکھا تھا وہ یقیناً مجھ سے بہت کچھ چھپائے ہوئے تھیں اور وہ کیا چھپائے ہوئے تھیں اب میں جاننا نہیں چاہتا تھا ٹیکسی اس کے گھر کے کھلے دروازے کے سامنے رکی تھی۔ ایک معمول کی طرح میں نے نیچے اتر کر ڈرائیور کو کرایہ دیا امی اب بلند آواز سے رو رہی تھیں، میں نے انہیں چپ کروانے کی کوشش نہیں کی، میں کیوں انہیں چپ کرواتا، گھر کے اندر سے رونے کی مدھم آوازیں گیٹ تک آ رہی تھیں۔

اکبر ماموں مجھے گیٹ پر ہی مل گئے تھے امی ان سے لپٹ گئی تھیں اور وہ دھاڑیں مار کر رونے لگے تھے۔ میں وہاں نہیں رکا لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا اندرونی دروازے تک آ گیا پتا نہیں وہاں کون کون تھا میں دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ رونے کی آوازیں ہال سے آ رہی تھیں مگر پورا گھر آہوں اور سسکیوں سے گونج رہا تھا میں میکانکی انداز میں چلتا ہوا ہال میں آ گیا کافور، لوبان اور گلاب کی ملی جلی خوشبو میری ناک سے ٹکرائی تھی اور میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔

⁂

ہال کے وسط میں سفید کفن میں چھپا ہوا جسم اسی کا تھا۔ اس کے جسم کے اوپر بے شمار گلاب کے پھول رکھے ہوئے تھے۔ میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر سکا، وہیں ہال کے دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی امی وہاں نہیں تھیں اور جو وہاں تھے وہ بھی شائد وہاں نہیں تھے میں بھی وہاں نہیں تھا، اور میں کہاں تھا؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔

کچھ عورتیں اس کے سرہانے بلند آواز میں سورۃ یٰسین کی تلاوت کر رہی تھیں۔ نانی امی سر کو ہاتھوں میں پکڑے بلند آواز میں رو رہی تھیں۔ اس کے ننھیال سے بھی سب لوگ وہاں آئے ہوئے تھے اور اس کی نانی بار بار غش کھا رہی تھیں۔ اس کی خالہ اس کے پاس بیٹھی ہوئی بار بار اس کا منہ چومتی تھیں اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونا شروع ہو جاتیں۔ اور جو رو نہیں رہے تھے وہ سکتے کے عالم میں تھے۔ میری طرح جیسے انھیں یقین نہیں آیا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا تھا۔

اور وہاں ایک کونے میں وہ بھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے نہ چہرے پر کوئی پریشانی یا پچھتاوا، وہ بس ایک پارہ پڑھ رہی تھی۔ جو لوگ مکمل ہوتے ہیں وہ مر جاتے ہیں اور جن لوگوں کی ذات نامکمل اور خامیوں کا مجموعہ ہوتی ہے وہ زندہ رہ جاتے ہیں، جیسے مہرین، میرا دل چاہا تھا میں دھکے دے کر اسے وہاں سے نکال دوں، آخر وہاں اس کا کیا کام تھا؟ وہ تماشائی بن کر مشعل کو زندگی ہارتے دیکھنے آئی تھی۔ اور ساری زندگی وہ تماشا ہی تو دیکھتی رہی تھی۔

یک دم میرا سانس گھٹنے لگا تھا۔ آخر میں بھی وہاں کیا لینے آیا تھا؟ مجھے لگا ابھی وہ آنکھیں کھولے گی اور مجھ سے کہے گی کہ اب میں کیا چاہتا ہوں میں اس کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتا؟ میں گھر سے باہر نکل آیا تھا اس کا بڑا بھائی اشعر مجھے دیکھ کر میری طرف آ گیا اور میرے گلے لگ کر رونے لگا۔ میں اسے کوئی دلاسا نہیں دے سکا، میں کیا کہتا یہ سب میری وجہ سے ہی تو ہوا تھا۔

ایک مشین کی طرح میں اس شام لوگوں سے ملتا رہا۔ رات کے آٹھ بجے ہم اس کا جنازہ لے کر قبرستان آئے تھے اسے ہمیشہ کے لیے وہاں چھوڑنے۔ اس کے جنازے کو کندھا دیتے ہوئے میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا، میں اس قابل کہاں تھا؟ لیکن اسے قبر میں دفن ہوتے دیکھ کر میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اسے لے کر کہیں بھاگ جاؤں، وہ اکیلی کیسے رہ سکتی تھی اس اجاڑ اور ویران جگہ پر؟ اسے تو شور اور ہنگامہ پسند تھا اور یہاں پر تو موت اور خاموشی تھی۔ وہ

یہاں کیوں آ گئی تھی؟ پھر اس کی قبر پر سب نے مٹی ڈالی تھی۔ میں بھی مٹی ڈالنے والوں میں شامل تھا۔ تو مشعل نام کی کہانی ختم ہو گئی تھی۔ اس کی مسکراہٹ، اس کے قہقہے، اس کی جگمگاتی آنکھیں، اس کی خوبصورت آواز اب کبھی کسی کو نظر نہیں آئے گی اور میں...... میری نظر سے یہ سب کبھی اوجھل نہیں ہوگا۔

کتنا عذاب ہوتا ہے کسی کا کبھی نظر نہ آنا اور کتنا عذاب ہوتا ہے کسی کا ہر وقت نظر آتے رہنا۔ ہم سب اسے وہاں چھوڑ کر واپس آ گئے تھے اور میں نے تو اسے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ شاید تب بھی اس نے زندہ ہوتے ہوئے بھی خود کو قبر میں دفن ہوتا ہوا محسوس کیا ہوگا۔ ممانی مسلسل غشی کے عالم میں تھیں۔ انھیں ہوش ہی نہیں آ رہا تھا اور جو ہوش میں تھے وہ بھی ہوش میں کہاں تھے۔

پتا نہیں تعزیت کے لیے کون کون آیا تھا؟ اس کی پوری یونیورسٹی جیسے وہاں آ گئی تھی۔ وہ جو یونیورسٹی کی جان تھی اب سب کو ہی اس کے بغیر رہنا پڑے گا۔ مہرین یونیورسٹی سے آنے والے اسٹوڈنٹس اور ٹیچرز سے ملتی رہی، اور میں سوچتا رہا تھا کہ اس کی راہ کا سب سے بڑا کانٹا دور ہونے پر وہ کتنی مسرور ہوگی اب کوئی یہ نہیں کہے گا کہ مشعل نے یہ کیا ہے یا مشعل ایسی ہے اب وہ ہمیشہ اس کے نام کے ساتھ ماضی کا صیغہ استعمال کریں گے۔ اور وہ جسے اس کی شہرت اور کامیابی سے نفرت تھی اب اس کی فکر ختم ہو جائے گی۔ دیر سے سہی پر خدا نے اس کی سن لی تھی۔

تمام رات گھر کا کوئی فرد سو نہیں پایا اور صبح۔ صبح میں اس وقت سکتے میں رہ گیا تھا جب اکبر ماموں نے میرے پاس بیٹھ کر کہا تھا۔

"پتا نہیں اس نے ایسا کیوں کیا؟ اسے کیا چاہیے تھا جو اس نے خودکشی کر لی؟"

مجھے لگا تھا جیسے میرے پاس کوئی بم پھٹا تھا اور میرے پرخچے اُڑ گئے تھے۔

"وہ مجھے کہتی اگر اسے کچھ چاہیے تھا پر اس طرح بغیر کچھ کہے کچھ بتائے اس نے ایسا کیوں کیا؟ اب میں کیا کروں گا؟ میرا تو گھر ویران ہو گیا۔"

وہ بات کرتے کرتے رونے لگے تھے۔ اور مجھے لگا تھا کسی نے میرے گلے میں وزنی زنجیروں کا ایک ایسا گچھا ڈال دیا تھا جو اب مجھے کبھی سر اٹھانے نہیں دے گا۔

ماموں کچھ دیر بعد مجھے اس کی موت کی تفصیلات بتانے لگے تھے۔ وہ لوگ اس رات کسی دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ گھر میں صرف نانی امی، مہرین، مشعل اور ملازم تھے۔ رات دیر گئے جب وہ لوگ گھر واپس آئے تو مشعل کا کمرہ بند تھا۔ ممانی ایک بار اس کے کمرے کی طرف گئی تھیں مگر اس کا کمرہ بند تھا اور لائٹ بھی آف تھی۔ انھوں نے سوچا وہ سو چکی ہوگی اس لیے انھوں نے اسے ڈسٹرب نہیں کیا اور واپس چلی گئیں مگر صبح جب وہ اسے اٹھانے آئیں اور بار بار دروازہ بجانے کے باوجود بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ پریشان ہو گئی تھیں۔ انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں اور ماموں کو بلوایا تھا۔ وہ چاروں مل کر دروازہ پیٹتے رہے مگر تب بھی اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔

شور کی آوازوں پر باقی ماموں بھی جمع ہو گئے تھے پھر اشعر نے دروازے کا لاک توڑ دیا تھا۔ اور جب وہ اندر داخل ہوئے تو وہ غنودگی کے عالم میں پڑی ہوئی بمشکل سانس لے رہی تھی۔ وہ سب اسے لے کر ہاسپٹل گئے تھے

مگر وہ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی مر چکی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھتے ہی اس کی موت کی تصدیق کر دی تھی۔ ماموں نے اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کر کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ پر اس کی موت کا سبب ہارٹ اٹیک لکھوا دیا اور پولیس کیس نہیں بننے دیا۔

سب لوگوں کو بھی یہی بتایا گیا تھا۔ صرف گھر کے لوگوں کو اس کی موت کی اصل وجہ کا علم تھا اور شاید یہ چیز ہی ان کے لیے زیادہ تکلیف دہ تھی کہ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لی تھی۔

سوئم تک ممانی کی حالت پہلے سے بہتر ہو چکی تھی اور سب لوگوں نے اس کی موت کو ذہنی طور پر قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر شاید ابھی بہت کچھ باقی تھا۔ گھر کی ملازمہ نے مشعل کو گھر والوں کے جانے کے تھوڑی دیر بعد مہرین کے کمرے میں جاتے دیکھا تھا۔ وہ دیر تک وہاں رہی تھی اور اس دوران کمرے سے ان دونوں کے جھگڑنے کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ ملازمہ نے کمرے کے پاس جا کر باتیں سننے کی کوشش نہیں کی مگر اس نے ماموں کو کہا تھا کہ مشعل جب زور زور سے بول رہی تھیں تو مہرین بی بی بہت ہنس رہی تھیں اور ان کے ہنسنے پر مشعل بی بی کو اور غصہ آیا تھا، وہ اور زیادہ بلند آواز سے بولنے لگی تھیں پھر کافی دیر کے بعد جب وہ کمرے سے نکلیں تو ان کا چہرہ غصہ سے سرخ تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ ابھی رونے لگیں گی۔ اپنے کمرے میں جانے کے کچھ دیر بعد وہ نیچے آئی تھیں اور انھوں نے چوکیدار کو کچھ خط گھر کے پاس لگے لیٹر بکس میں ڈالنے کے لیے دیے تھے اور پھر وہ یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں کہ کوئی انھیں ڈسٹرب نہ کرے وہ سونے جا رہی ہیں۔

ماموں نے اسی وقت مہرین کو بلوایا تھا۔ اور اس سے پوچھا کہ مشعل کی موت والی رات ان دونوں کے درمیان کس بات پر جھگڑا ہوا تھا۔ پہلے تو اس نے سرے سے اس بات سے انکار کیا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوا تھا مگر جب ماموں نے ملازمہ کو ساری باتیں بتانے کو کہا تو وہ بے حد پریشان ہو گئی تھی وہ کچھ بھی نہیں بتا سکی تھی۔

سب لوگ یک دم اس کے خلاف ہو گئے تھے۔ وہ سب اسے اصل بات بتانے پر مجبور کر رہے تھے مگر وہ کچھ بھی نہیں بتا رہی تھی۔ وہ صرف یہ کہہ رہی تھی کہ مشعل اس سے ناراض تھی مگر کیوں ناراض تھی یہ اس نے نہیں بتایا۔ میں جانتا تھا کہ مشعل اس سے کیوں ناراض تھی مگر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس بات پر اپنے غصے کا اظہار کرنے کے لیے منگنی کے ایک ہفتے کے بعد اس سے لڑنے گئی ہو گی۔ بات یقیناً کچھ اور ہو گی اور بات کیا تھی وہ یہ نہیں بتا رہی تھی۔

اشعر نے چوکیدار سے ان خطوں کے بارے میں پوچھا تھا مگر وہ بھی ان کے پتے کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا۔ لیٹر باکس میں خط بھی نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ انھیں پوسٹ کیے تیسرا دن ہو چکا تھا۔ اشعر نے اس کے کمرے کی تلاشی لی تھی مگر وہاں سے صرف اس کی جلی ہوئی ڈائری برآمد ہوئی تھی اور میں جانتا تھا کہ اس نے اپنی ڈائری کیوں جلائی ہو گی صرف مجھے بچانے کے لیے تاکہ کوئی مجھے اس کی موت کا ذمہ دار نہ ٹھہرا سکے۔

کسی کو یہ علم نہ ہو سکے کہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔

اگر وہ مہرین سے ناراض ہوتی تو وہ کبھی بھی یہ منگنی نہ ہونے دیتی۔ وہ اپنے باپ سے میرے لیے پسندیدگی

کا اظہار کرتی تو اکبر ماموں میری امی کو مجبور کر سکتے تھے کہ وہ مہرین کو بہو نہ بنائیں اور اس کی جگہ مشعل سے میری شادی کریں مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ یقیناً مہرین جھوٹ بول رہی تھی۔ سب کے اصرار کے باوجود اس نے بتانے سے انکار کر دیا تھا اور اشعر، وہ اس قدر طیش میں آ گیا تھا کہ وہ اسے شوٹ کر دینا چاہتا تھا۔ سب نے اسے پکڑ لیا اور میرا دل چاہا تھا کہ کوئی اسے نہ پکڑتا، وہ اسے شوٹ کرنے دیتے۔ مہرین مر جاتی تو کیا فرق پڑتا؟

اگر دنیا کو مشعل کے مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا تو مہرین کے نہ ہونے سے کیا ہو جاتا؟

''تم اگر نہیں بتاؤ گی کہ تم نے مشعل سے کیا کہا تھا تو میں تمھیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔''

اشعر نے اسے دھمکی دی تھی لیکن وہ اسی طرح چپ رہی تھی اور پھر اچانک اشعر نے تیزی سے جا کر اس کا گلا پکڑ لیا تھا۔ وہ اس کا گلا دبا رہا تھا سب اسے چھڑانے کے لیے بھاگے تھے مگر میں نہیں اٹھا تھا میں اسے کیوں بچاتا، کیا اس نے مشعل کو بچایا تھا؟ ماموں اشعر کو کھینچ کر باہر لے گئے تھے مگر وہ اسے گالیاں دے رہا تھا۔ وہ بار بار کہتا جا رہا تھا۔

''میں اس کتیا کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، یہ ناگن ہے، ساری عمر یہ ہمارا کھاتی رہی اور اس نے میری بہن ہی کو ڈس لیا، میں اسے مار دوں گا۔''

میں کمرے سے باہر نکل گیا اور اس رات میں نے امی سے کہا تھا۔

''میں مہرین سے شادی نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں۔''

انھوں نے اس کی صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔

''اسود اس بے چاری کا کیا قصور ہے، سب اس کے دشمن ہو رہے ہیں، اگر تم بھی......''

میں نے ان کی بات کاٹ دی۔

''مشعل کا کیا قصور تھا۔ اسے کس بات کی سزا ملی ہے۔ اس نے تو کبھی کسی کا برا نہیں چاہا پھر بھی وہ مر گئی اور یہ تو زندہ ہے۔ اسے کیا فرق پڑا ہے لوگوں کے دشمن ہونے سے۔ میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔ یہ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔''

میں ان سے یہ کہنے کے بعد سیدھا مہرین کے پاس گیا تھا۔ اس کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ میں دستک دیے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ وہ ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

''میں تم سے یہ پوچھنے نہیں آیا ہوں کہ تم نے اسے کیسے مارا میں صرف وہ انگوٹھی لینے آیا ہوں جو تمھارے ہاتھ میں ہے، اور یہ بتانے آیا ہوں کہ اب تمھارے اور میرے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے۔ تم کسی اور کو ڈھونڈ لو جو تمھارے اس بھیانک چہرے اور کردار کو برداشت کر سکے۔ لوگ ٹھیک کہتے ہیں باہر سے خوبصورت وہی ہوتے ہیں جو اندر سے خوبصورت ہوں اور جو اندر سے خوبصورت نہ ہوں خدا انھیں ظاہری خوبصورتی بھی نہیں دیتا جیسے تم۔''

ایک لمحہ کے لیے اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا مگر پھر اس نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر میری طرف بڑھا دی، ایک جھٹکے سے اس سے انگوٹھی لے کر میں باہر نکل آیا تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں اس نے مشعل کو مرنے کے لیے مجبور کیا تھا جہاں اس نے مشعل کو کچھ ایسا کہا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں اپنی زندگی ختم کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

اگلی صبح میں واپس کراچی لوٹ آیا تھا۔ وہاں رہ کر اب کرتا بھی کیا، وہاں بچا ہی کیا تھا؟ امی ابھی ماموں کے گھر پر ہی تھیں۔ انھیں مشعل کے دسویں کے بعد آنا تھا۔ اس شہر سے واپس آ کر آزادی کا احساس ہوا تھا۔ ورنہ مجھے لگتا تھا جیسے ہر وقت کوئی چیز مجھے گھیرے رکھتی ہے۔ جیسے ہر وقت کوئی مجھ پر ہنستا رہتا ہے، اور یہاں آ کر مجھے لگا تھا جیسے اب میں سانس لے سکتا ہوں۔

............❀............

واپس آنے کے اگلے دن میں نے آفس جوائن کر لیا تھا۔ پورا دن آفس گزارنے کے بعد میں شام کو واپس آیا تھا۔

اسٹڈی میں آنے کے بعد میں اسٹڈی ٹیبل پر رکھی ہوئی گزشتہ دنوں کی ڈاک دیکھ رہا تھا۔ ایک لفافے پر نظر پڑتے ہی میرا سانس رک گیا تھا۔ میں اس تحریر کو لاکھوں میں پہچان سکتا تھا وہ مشعل کے ہاتھ سے لکھا ہوا پتا تھا میں نے بے تابی سے لفافہ کھولا ایک رقعہ ٹیبل پر گر پڑا میں نے اسے اٹھایا اس کی آخری تحریر میرے سامنے تھی:

”اسود علی!

میں جو ہمیشہ تمھارے لیے دعائیں کرتی رہی ہوں، آج پہلی بار تمھیں کوئی دعا نہیں دوں گی نہ یہ کہوں گی کہ تم ہمیشہ سلامت رہو اور نہ یہ کہ تم خوش بھی رہو اور لمبے عرصے تک جیو بھی۔ میں تو صرف یہ سوچ رہی ہوں کہ میں نے تم پر اعتبار کیا کیسے؟ میں تو کبھی کسی سے دھوکا نہیں کھاتی تھی، مجھے تو بہت فخر تھا کہ مجھے لوگوں کی پہچان ہے، میں چہرے سے انھیں جان لینے کا دعویٰ کرتی تھی۔ پر مجھے پتا ہی نہیں چلا میں نے کب تمھارے جیسا سانپ اپنی آستین میں پال لیا۔

مانتی ہوں زندگی میں پہلی بار اعتراف کرتی ہوں کہ میں بے وقوف ہوں بلکہ پاگل ہوں اور یہ جو سچائی اور اچھائی کے پھندے میں نے اپنے گلے میں ڈال رکھے تھے نا اب یہ ہی مجھے مار ڈالیں گے۔ میری سچائی کہاں میرے کام آئی ہے اور میری اچھائیوں نے کب مجھے نقصان سے بچایا ہے۔ میں نے تو کبھی کسی کا برا نہیں چاہا، میں نے تو کبھی کسی کو فریب نہیں دیا پھر میری زندگی میں تم کیوں آ گئے آخر تمھیں میں نے کیا تکلیف پہنچائی تھی؟

آج مہرین نے مجھے بتایا تھا کہ تم شروع سے ہی اسی سے محبت کرتے تھے۔ میرے ساتھ صرف اُسے خوش کرنے کے لیے افیئر چلا رہے تھے۔ اس نے مجھے تمھارے ہاتھ سے لکھے گئے خطوط دکھائے تھے جن میں تم نے میرا مذاق اڑایا تھا۔ تم نے لکھا تھا کہ مجھے تماشا بنا کر تمھیں اس لیے خوشی ہو رہی ہے کیونکہ تم نے مہرین کو خوش کر دیا ہے۔ ہاں واقعی تم نے مجھے تماشا بنا دیا ہے مگر تم خود بھی ایک دن تماشا بن جاؤ گے کیونکہ جس مہرین کے لیے تم نے میرے ساتھ یہ فراڈ کیا وہ بھی تم سے فراڈ کر رہی ہے اس نے منگنی تمھارے ساتھ ضرور کی ہے مگر شادی وہ تمھارے ساتھ نہیں کرے گی۔ وہ شادی اسفند سے کرے گی جس سے وہ محبت کرتی ہے اور پھر تم بھی میری طرح خالی ہاتھ رہ جاؤ گے۔

اسود تم دونوں نے میرے ساتھ یہ سب کیوں کیا؟ آخر کیوں؟ میں نے تو کبھی تم دونوں کا برا نہیں چاہا کبھی تم دونوں کو نقصان نہیں پہنچایا۔ تم جانتے ہو میں مہرین سے کتنی محبت کرتی تھی۔ میں نے اسے ہر نقصان، ہر مصیبت سے

بچانے کی کوشش کی تھی مگراس نے مجھے ہی اپنی ضد اور حسد کی بھٹی میں جھونک دیا۔

کیا میرا گناہ یہ تھا کہ میں خوبصورت ہوں اور وہ معمولی صورت کی مالک ہے۔ جو خوبصورت ہوتے ہیں کیا انھیں میری طرح صلیب پر چڑھا دیا جاتا ہے؟ کیا اچھے لوگوں کے مقدر میں صرف دھوکا کھانا ہوتا ہے۔ شاید ایسا ہی ہوتا ہے۔

تم دونوں ساری زندگی خوش رہو گے۔ مہرین کسی اور سے شادی کرے گی تب بھی خوش رہے گی تم سے شادی کرے گی تب بھی اسے سب کچھ مل جائے گا۔ شوہر کی محبت، عزت، دولت، اولاد، سکون، خوشیاں چاہے وہ اس کی مستحق ہو یا نہ ہو پر کاش اسے یہ سب کچھ نہ مل پائے۔ تم سے شادی کر کے بھی وہ ہر چیز سے محروم رہے جیسے آج میں محروم ہوں لیکن اللہ کیا میری اس آخری خواہش کو پورا کرے گا؟

ہاں آخری خواہش کو کیونکہ میں اب تم دونوں کے سامنے نظر اٹھانے کے قابل نہیں رہی ہوں اور میں تو کسی کے سامنے بھی اب نظر نہیں اٹھا پاؤں گی۔ وہ ہر ایک کو بتا دے گی کہ اس نے کس طرح مجھے بے وقوف بنایا ہے اور لوگ مجھ پر ہنسیں گے پورے خاندان والے میرا مذاق اڑائیں گے پھر میں کیا کروں گی؟

میرے لیے یہی بہتر ہے کہ میں مر جاؤں۔ مشعل کو اب مر ہی جانا چاہیے اور تم اسود علی تم وہ تھے جسے میں نے چاہا تھا اور تم نے میرے ساتھ کیا کیا؟''

میرے ہاتھ سے کاغذ چھوٹ گیا تھا۔ میں کرسی پر گر پڑا، سو وہ اس لیے مر گئی کہ اسے لگا کہ میں نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے اور یہ بات اسے مہرین نے کہی تھی۔ تو مشعل کی زندگی کی اس آخری رات کو اسے یہ کہا گیا تھا۔ میں سر کو ہاتھوں لیں تھامے وہاں بیٹھا رہا۔

میری زندگی میں مہرین کتنی بار شب خون مارے گی، آخر کتنی بار، اسے یہ جھوٹ بول کر کیا ملا؟ کیوں اس نے مشعل کو مرنے پر مجبور کر دیا؟ میرا دماغ سوالوں سے پھٹ رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں مہرین کو ایسے دہکتے ہوئے الاؤ میں پھینک دوں جہاں وہ جلتی رہے، اتنی دیر تک جلتی رہے جب تک اسے اپنی زندگی کے سارے گناہ یاد نہ آ جائیں۔

اس نے پتا نہیں اپنی کس کس محرومی کا بدلہ لیا تھا۔ مگر کیا اس کی محرومیوں کی ذمہ دار مشعل تھی یا کیا میں اس کا ذمہ دار تھا؟ اگر میری زندگی میں مشعل کو نہیں آنا تھا تو اب مہرین کی زندگی میں بھی کوئی اسفند نہیں آئے گا۔ اگر مشعل زندگی کی ہر چیز سے محروم ہوگئی تھی تو وہ بھی ہو جائے گی مشعل تو ایک بار مری تھی مگر مہرین بار بار مرے گی۔

میں نے امی کو لاہور فون کیا تھا اور انھیں کہا تھا کہ میں منگنی برقرار رکھنا چاہتا ہوں وہ میرے فیصلے پر حیران رہ گئی تھیں۔ ابھی کل ہی تو میں انھیں منگنی کی انگوٹھی دے کر آیا تھا اور آج میں انھیں کہہ رہا تھا کہ میں اس سے منگنی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کچھ بول نہیں پائی تھیں۔ میں نے انھیں اس کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ میں نے فون بند کر دیا تھا۔ پھر میں نے انھیں فون نہیں کیا۔

مشعل کے دسویں کے بعد وہ کراچی آ گئی تھیں۔ میں دسویں پر نہیں گیا۔ میں اب وہاں صرف ایک بار جانا

چاہتا تھا، صرف ایک بار۔

امی نے ابھی مہرین سے منگنی کی بات نہیں کی تھی۔ وہ یہ بات مشعل کے چہلم کے بعد کرنا چاہتی تھیں۔ میں نے کوئی اصرار نہیں کیا تھا جلدی مجھے بھی نہیں تھی۔ مشعل کے چہلم پر امی لاہور گئی تھیں اور چند دن وہ وہیں رہیں پھر انھوں نے مجھے وہاں سے فون کر کے کہا تھا کہ مہرین اب منگنی پر رضامند نہیں ہو رہی۔

ایک آگ تھی جو میرے اندر بھڑک رہی تھی میں نے انھیں کہا تھا۔

''وہ رضامند ہو رہی ہے یا نہیں اب مجھے اس سے شادی کرنا ہے ہر قیمت پر چاہے مجھے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے اور اگر مجھ سے اس کی شادی نہیں ہوئی تو پھر کہیں بھی نہیں ہوگی۔''

''تم کیسی باتیں کر رہے ہو اسود تم اس سے کون سا بدلہ لینا چاہتے ہو؟''

''میں کوئی بدلہ لینا نہیں چاہتا مجھے صرف اس سے شادی کرنا ہے اور اگر یہ شادی نہ ہوئی تو میں بھی مشعل کی طرح خود کو شوٹ کر لوں گا مگر اس کو بچنے نہیں دوں گا میں یہ لکھ کر رکھ جاؤں گا کہ میری موت کی ذمہ دار وہ ہے پھر میں دیکھ لوں گا وہ خود کو کیسے بچائے گی؟''

میں نے فون کا ریسیور پٹخ دیا تھا۔

میں نہیں جانتا کہ امی نے اسے کیا کہا تھا، کیا واسطہ دیا تھا، کون سی دھمکی کا استعمال کیا تھا؟ مگر جب وہ واپس آئی تھیں تو اس کی رضامندی کی خبر لائی تھیں۔

مشعل کے گھر والے اس خبر سے برہم تھے اور انھوں نے ہم سے قطع تعلق کر لیا تھا مہرین اپنی امی کے پاس چلی گئی تھی اور پورے تین ماہ بعد میں اسے بہت سادگی سے بیاہ لایا تھا۔ میں نے اس کی امی کی ساری التجائیں مسترد کر دی تھیں۔ وہ اس کی شادی بہت دھوم دھام سے کرنا چاہتی تھیں مگر مجھے کسی دھوم دھام کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ سب خوشی کے اہتمام ہوتے ہیں اور میں خوش نہیں تھا۔

شادی کی رات اپنے کمرے میں جانے سے پہلے امی نے مجھے کہا تھا۔

''مہرین بے قصور ہے اسود، اس کی کوئی غلطی نہیں ہے، اس نے کچھ نہیں کیا۔ تم اس پر کوئی زیادتی مت کرنا، جو ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ، اب وہ تمہاری بیوی ہے۔ اس کی عزت اور محبت کرنا تمہارا فرض ہے۔ میں نے اسے رضامند کرنے کے لیے اسے بہت وعدے دیے تھے۔ اب میری زبان کا پاس رکھنا۔''

مجھ پر ان کی کسی التجا کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''ہاں میں جانتا ہوں کہ وہ میری بیوی ہے اور مجھے دیکھنا ہے کہ وہ کتنی اچھی بیوی ہے۔ بے قصور تو کوئی اور بھی تھا پھر بھی کیا ہوا؟''

''اسود۔'' امی نے میرا بازو پکڑ کر پتا نہیں مجھے کیا یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔

''آپ فکر نہ کریں امی وہ زندہ رہے گی، اسے کچھ نہیں ہوگا میں اسے قتل کرنے کی حماقت نہیں کروں گا۔''

میں نے ان کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹاتے ہوئے انھیں تسلی دی تھی۔ پھر میں کمرے میں آ گیا تھا۔

وہ سر جھکائے عروسی لباس میں اس جگہ بیٹھی ہوئی تھی جہاں میں مشعل کو دیکھنا چاہتا تھا اور مشعل اس وقت قبر میں تھی۔ میرا خون کھول رہا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس کے گلے میں پھندہ ڈال کر اسے چھت سے لٹکا دوں تب تک جب تک اس کا سانس بند نہ ہو جائے مگر مجھے کچھ اور کرنا تھا۔

''یہ وہ کمرہ ہے جہاں آنے کی خواہش شاید تم نے کبھی نہ کی ہو پر جسے یہاں آنے کی خواہش تھی تم نے اسے قبر میں پہنچا دیا۔''

میں نے اس کے سر سے دوپٹہ اتار کر دور پھینک دیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔

''میری جگہ تو تم شاید اسفند کو دیکھنا چاہ رہی تھیں یا شاید کسی اور کو، کچھ پتا نہیں ہوتا تم جیسی لڑکیوں کا، کب کس پر فدا ہو جائیں۔'' اس نے نظریں جھکا لیں۔

''اس خط کو پڑھو یہ اس نے مجھے اس رات کو لکھا تھا جب تم نے اسے یہ کہا تھا کہ میں نے اسے فریب دیا۔ اس کے ساتھ دھوکا کیا۔''

میں نے اس خط کو جیب سے نکال کر اس کے چہرے کے سامنے کر دیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر خط کو دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔

''میں نے اسے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔'' چند لمحوں کے بعد اس نے کہا تھا۔

''کتنا جھوٹ بولو گی آخر کتنا جھوٹ بولو گی؟ کیا تمھیں خود سے گھن نہیں آتی؟ کوئی ایک خوبی بھی نہیں ہے تم میں بلکہ خامیوں کا مرقع ہو۔ صرف چہرہ بدصورت نہیں ہے، تمہارا دل اس سے بھی زیادہ گھناؤنا ہے۔ دماغ اس سے بھی زیادہ مکروہ ہے اور زبان اس سے بھی زیادہ گھٹیا ہے اور تمہارا ہر جھوٹ تمھارے چہرے کی بدصورتی میں اضافہ کرتا جاتا ہے۔ کبھی زندگی میں سچ بولا ہے تم نے جیسے مشعل بولتی تھی؟ لیکن سچ نے اگر مشعل کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا تو اب جھوٹ بھی تمھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔

میں تمھارے اس بھیانک چہرے کو لوگوں کے سامنے ظاہر کروں گا، انھیں تمہاری اصلیت بتاؤں گا اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگ تم پر تھوکیں گے بالکل اسی طرح۔''

میں نے اس کے چہرے پر تھوک دیا اس نے آنکھیں بند کر لیں اور آنکھیں بند کیے ہوئے ہاتھ سے اپنا چہرہ صاف کیا۔ میں بیڈ سے کھڑا ہو گیا۔

''اسود اس کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے، اس رات میں نے اسے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔''

اب وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ اپنے ہاتھوں کی پشت پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

''آج آخری بار تم نے میرا نام لیا ہے۔ آئندہ تم اپنی گندی زبان سے میرا نام نہیں لو گی۔ جو بات مشعل نے کہی ہے وہ کبھی جھوٹ نہیں ہو سکتی، کبھی نہیں اور تمہاری تو پوری ذات ہی جھوٹ سے بنی ہے۔ تمہارا باپ بھی یونہی جھوٹ بولتا تھا، اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے وہ کس طرح گھر گھر جا کر کہانیاں گھڑ کر سناتا تھا، یہ میں اچھی طرح جانتا

ہوں اور تم بھی اس کی اولاد ہو۔ یاد ہے ناں اس کی لاش ایک گندی نالی میں پڑی پائی گئی تھی اور تم بھی ایک دن اسی طرح کسی سڑک کے کنارے پائی جاؤ گی۔ تمھارے باپ کو تو نشہ نے مارا تھا مگر تمھیں تمہارا جھوٹ مارے گا۔

اس زیور اور لباس کو اتار دو۔ آج کے بعد تم کبھی کوئی زیور نہیں پہنو گی، کبھی کوئی اچھا لباس نہیں پہنو گی۔ تمھارے جسم پر وہ لباس ہونا چاہیے جو تمھیں تمہاری اوقات یاد دلاتا رہے۔ اپنی ماں کو بتا دینا کہ اب نہ وہ تم سے ملنے آئے نہ تم ان سے ملنے جاؤ گی۔ تمھیں میرے گھر سے صرف اتنا رزق ملے گا جس سے تم زندہ رہ سکو اور تمہارا جسم ڈھکا رہے اور کسی چیز پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔''

وہ میرے خاموش ہونے پر بیڈ سے اٹھ گئی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں جا کر اس نے کارپٹ پر پڑا ہوا دوپٹہ اٹھایا اور ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

میں نے فریج میں سے پانی کا گلاس لے کر پیا مگر میرے غصے کی آگ ابھی بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔

وہ کچھ دیر بعد ایک سادہ سوٹ میں ملبوس ڈریسنگ سے باہر آئی تھی۔ بہت خاموشی سے بیڈ کے دوسری طرف جا کر تکیہ لیے بغیر کارپٹ پر لیٹ گئی تھی۔ میں نے لائٹ آف کر دی بستر پر لیٹ کر میں اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر میں آنکھیں بند کر کے سو گیا۔ اگلی صبح پانچ بجے الارم کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میں نے کمرے کی لائٹ جلا دی۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

''چھ بجے کی فلائٹ سے تم میرے ساتھ کراچی جا رہی ہو۔'' میں اسے اطلاع دے کر واش روم میں چلا گیا۔ بیس منٹ میں نہانے کے بعد میں کپڑے پہن کر تیار ہو چکا تھا۔ ڈرائنگ روم میں آ کر میں نے ایک بیگ میں اپنی چیزیں رکھیں اور کمرے میں آ گیا وہ اسی طرح کارپٹ پر بیٹھی تھی۔

''صرف منہ دھوؤ اور اپنا بیگ لے کر باہر آ جاؤ۔'' میں اسے ہدایات دے کر باہر آ گیا۔ ملازم کو اٹھا کر میں نے اپنے جانے کی اطلاع دی تھی اور اسے کہا تھا کہ وہ ہمیں گاڑی پر ائیر پورٹ چھوڑ آئے۔

وہ بے حد حیران تھا مگر اس نے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کی۔ وہ میرا بیگ گاڑی میں رکھ رہا تھا جب وہ باہر آئی تھی۔ ملازم نے اس کا بیگ پکڑنا چاہا مگر میں نے اسے روک دیا۔

''یہ خود رکھ لے گی۔'' مہرین نے گاڑی میں اپنا بیگ رکھ دیا۔ پھر ملازم ہمیں ائیر پورٹ چھوڑ آیا تھا۔

کراچی پہنچنے کے بعد میں اسے گھر چھوڑنے کے بعد سیدھا آفس چلا آیا تھا۔ شام کو جب میں گھر واپس پہنچا تو امی کا فون آیا تھا۔ وہ صبح سے بار بار فون کر رہی تھیں مگر آفس میں، میں نے اپنے پی اے کو ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ لاہور کی کوئی بھی کال میرے فون سے کنیکٹ نہ کرے۔

''یہ کیا حرکت کی ہے تم نے کسی کے سامنے مجھے نظر اٹھانے کے قابل نہیں رکھا۔ اس طرح اسے لے کر کراچی چلے گئے ہو، تمھیں شرم نہیں آئی کہ میں اس کی ماں کو کیا منہ دکھاؤں گی؟''

''اس میں شرمندگی والی کوئی بات نہیں ہے میں اپنی بیوی کو لے کر یہاں آیا ہوں۔ ویسے بھی ولیمہ کی کوئی دعوت میں نے ارینج نہیں کی تھی اور جہاں تک مہرین کی امی کی بات ہے تو آپ ان سے کہہ دیں کہ اب وہ اپنی بیٹی کو

بھول جائیں۔ اب مہرین کبھی ان سے نہیں ملے گی۔ آپ نے جب کراچی آنا ہو مجھے فون کر دیں میں ٹکٹ کا بندوبست کر دوں گا۔ ویسے پرسوں کی ایک فلائٹ کا ٹکٹ ملازم کو دے کر آیا تھا وہ اس نے آپ کو دے دی ہوگی باقی سب کچھ ٹھیک ہے مہرین بھی یہاں بہت خوش ہے اور میں بھی خدا حافظ۔"

میں نے فون بند کر دیا اور پھر ریسیور اٹھا کر نیچے رکھ دیا۔

"اس گھر میں ملازم ہیں اور رہیں گے بھی مگر ان میں سے کوئی بھی ملازم تمھارے لیے نہیں ہے۔ تم کبھی ان سے اپنا کوئی کام نہیں کراؤ گی! تم اپنا ہر کام خود کرو گی۔ اپنے لیے کھانا الگ بناؤ گی، تمھارے استعمال کے برتن بھی الگ ہوں گے۔ تم میری کسی چیز کو میری اجازت کے بغیر ہاتھ نہیں لگاؤ گی چاہے وہ کارنس پر پڑا ہوا کرسٹل باؤل ہی کیوں نہ ہو۔ میں کبھی بھی تمھیں کوئی روپے نہیں دوں گا۔ زندہ رہنے کے لیے کھانے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ تمھیں مل جائے گا۔ باقی چیزیں بہت غیر اہم ہیں۔

تم کبھی کوئی فون ریسیو نہیں کرو گی۔ چاہے گھر میں کوئی بھی نہ ہو تب بھی تم فون کے پاس نہیں جاؤ گی۔" اس نے سر جھکائے میری ہدایات سنی تھیں میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

حسب توقع امی اگلے دن ہی چلی آئی تھیں انھوں نے مجھے بے حد ڈانٹا تھا۔ میں نے بڑے پرسکون انداز میں ان کی جھاڑ سنی تھی اور مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں اب بھی اپنی بات پر قائم تھا کہ میں اب مہرین کو کسی سے ملنے نہیں دوں گا چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ میں نے انھیں مہرین پر عائد کی جانے والی پابندیوں کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ گنگ بیٹھی رہیں پھر انھوں نے کہا تھا۔

"تم یہ سب کرنے کے لیے اس سے شادی کرنا چاہتے تھے؟"

"ہاں یہی سب کرنے کے لیے اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔"

میں نے کرسی پر جھولتے ہوئے کہا۔

"یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے میں نے ہی اسے اس شادی پر تیار کیا تھا نہ میں اس سے اصرار کرتی نہ وہ اس جہنم میں آتی۔" میں نے ان کی بات پر کرسی پر جھولنا بند کر دیا۔

"آپ اس پچھتاوے سے باہر نکل آئیں۔ وہ آپ کی بات نہ مانتی تب بھی مجھے شادی اس سے ہی کرنا تھی چاہے زبردستی سہی اور میں اس کے لیے ہر حربہ استعمال کرتا چاہے مجھے اسے کڈنیپ ہی کیوں نہ کروانا پڑتا مگر اسے آنا اسی گھر میں تھا۔ سو آپ کے اصرار نے اسے اس جہنم میں آنے پر مجبور نہیں کیا۔ اس کا کردار اسے یہاں لایا ہے اور اسے یہیں آنا تھا۔"

"اسود تم یہ سب مت کرو، تمھیں کیا پتا غلطی کس کی تھی کس کی نہیں؟ تم باز آ جاؤ سزا اور جزا تمھارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ صرف ایک ہی برتر ذات کے ہاتھ میں ہے۔ تم انسان ہو اپنی حدود کو جان لو اس کی طاقت اس کے اختیار کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش نہ کرو۔"

"مجھے سب پتا ہے، مجھے نصیحت نہ کریں۔ کون سچا ہے، کون جھوٹا، کسے سزا ملنی چاہیے کسے انعام، اس کا

فیصلہ یہیں ہو جانا چاہیے۔ ہاتھ کا بدلہ ہاتھ اور سر کا بدلہ سر، یہ بھی ہمارے ہی مذہب میں ہے میں تو پھر اس کی جان نہیں لے رہا ہوں۔"

"مگر معاف کر دینے والا عظیم ہوتا ہے اور معاف کر دینا سب سے افضل عمل ہے۔"

"مجھے عظیم بننا ہے نہ کوئی افضل عمل کرنا ہے۔ جو عظیم ہوتے ہیں اور افضل عمل کرتے ہیں ان کا حال مشعل جیسا ہوتا ہے، کم سے کم رسوائی اور زیادہ سے زیادہ موت۔ ان دونوں چیزوں میں سے ایک ان کا مقدر ضرور بنتی ہے۔ سو آپ مجھے یہ بے کار کی نصیحتیں نہ کریں۔" میں نے ایک بار پھر کرسی کو جھلانا شروع کر دیا تھا۔

کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد امی نے مجھے کہا تھا۔

"تم یہ سب کرنے کی بجائے اسے طلاق دے دو۔" میں ان کی بات پر بے اختیار ہنسا تھا۔

"طلاق بھی دوں گا، یہ کام بھی کروں گا مگر ابھی نہیں، بیس سال بعد جب کوئی اس پر دوسری نگاہ نہیں ڈالے گا۔ جب وہ دوبارہ اپنا گھر آباد کرنے کے قابل نہیں ہوگی تب میں اسے خالی ہاتھ دھکے دے کر اپنے گھر سے نکال دوں گا اور اسے کہوں گا کہ جاؤ اب دوبارہ سے اپنے لیے کوئی ٹھکانہ تلاش کرو، ڈھونڈو اب دنیا میں تمھارے لیے کیا ہے؟ اگر کچھ نہیں ملتا تو پھر تم بھی مشعل کی طرح مر جاؤ۔"

"اسود میں اسے تم سے خلع دلوا دوں گی میں اسے تمھارے ساتھ نہیں رہنے دوں گی۔"

"امی کیا وہ مجھ سے خلع لے سکتی ہے کیا اس قابل ہے وہ؟ لے جایئے گا کبھی عدالت میں اسے اپنا شوق پورا کرنے کے لیے پھر دیکھیے گا کتنے سال وہ ان عدالتوں کے چکر کاٹتی ہے اور میں جو اس پر ایسے الزام لگاؤں گا کہ دنیا تو کیا وہ خود اپنا چہرہ دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہے گی۔

میں عدالت میں ایک چھوڑ سو ایسے گواہ پیش کر دوں گا جو اس سے اپنے تعلقات کا دعویٰ کریں گے، وہ بھی تمام ثبوتوں کے ساتھ پھر آپ کیا کریں گی اور وہ کیا کرے گی؟ اور میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ ان سب باتوں کے باوجود ایک اچھے شوہر کی طرح میں اس بدکردار بیوی کو بھی اپنے گھر میں آباد کرنا چاہتا ہوں۔ سب میری عظمت کے گن گاتے ہوئے اسے واپس میرے ہی گھر بھیج دیں گے اور بالفرض اگر وہ خلع لینے میں کامیاب ہو بھی جاتی ہے تو بھی تیزاب کی ایک بوتل اسے اس قابل نہیں چھوڑے گی کہ وہ دوبارہ کبھی اپنا گھر بسانے کا سوچے پھر آپ بھی اس کی مدد نہیں کر پائیں گی چاہے جتنا بھی چاہیں۔

تو امی مان لیں کہ وہ سب سے زیادہ محفوظ اور خوش یہیں رہے گی، اس چار دیواری کے اندر اور اسے یہیں رہنا ہے چاہے آپ کو پسند آئے یا نہیں، چاہے وہ ایسا چاہے یا نہیں۔"

امی خوف کے عالم میں مجھے دیکھتی رہیں۔

"تم ایسے نہیں تھے اسود تم کبھی بھی ایسے نہیں تھے۔"

"ہاں ایسا نہیں تھا مگر اب ہو گیا ہوں۔" میں وہاں سے اٹھ کر باہر آ گیا۔

پھر سب کچھ ویسا ہی ہونے لگا تھا جیسا میں چاہتا تھا۔ وہ بالکل میری ہدایات کے مطابق چلتی تھی۔ اسے ہر

حال میں صبح چار بجے اٹھ جانا ہوتا تھا اور رات کو وہ بارہ بجے سے پہلے نہیں سو سکتی تھی چاہے وہ اپنے سب کام نپٹا چکی ہوتی تب بھی، یہ میری ہدایات تھیں۔

وہ صرف گھر کے اندر پھر سکتی تھی، چھت پر، لان میں یا پورچ میں نکلنے کی اجازت اسے نہیں تھی۔ وہ صرف صبح یا رات کے وقت کھانا کھا سکتی تھی اور وہ بھی صرف دال یا سبزی اس کے علاوہ اسے کچھ نہیں دیا جاتا تھا۔

امی اسے دیکھ کر بعض دفعہ رونے لگتی تھیں اور مجھے بددعائیں دینا شروع ہو جاتیں یا خود کو کوسنے لگتیں مگر مجھے ان چیزوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ تو زندہ تھی اور مشعل وہ تو مر گئی تھی پھر بھی انھیں مہرین کا زیادہ خیال تھا مشعل کا نہیں۔

دن گزرنے لگے تھے امی بھی آہستہ آہستہ نارمل ہوتی چلی گئی تھیں یا کم از کم مجھے نارمل لگنے لگیں۔ مہرین نے بھی شاید اپنی سزا کو قبول کر لیا تھا۔ وہ کسی شکوے یا شکایت کے بغیر میری ہر ہدایت پر عمل کرتی۔ اسے اور کرنا بھی کیا تھا۔

بعض دفعہ میرا دل چاہتا وہ روئے گڑگڑائے، مجھ سے فریاد کرے، مجھ سے معاف کرنے کی بھیک مانگے اور میں، میں اس کی بے بسی پر قہقہے لگاؤں اور پھر ایسا موقع مجھے مل ہی گیا تھا۔

............❀............

ایک دن میں رات کو اسٹڈی میں کام کر رہا تھا جب وہ میرے پاس آئی تھی۔

"مجھے آپ سے ایک بات کرنا ہے۔" اس نے اسٹڈی ٹیبل کے پاس کھڑے ہو کر کہا تھا۔

"کرو۔"

"میرے فائنل ائیر کے پیپرز شروع ہونے والے ہیں اگلے ہفتے سے، میں پیپرز دینے کے لیے لاہور جانا چاہتی ہوں۔" میں نے اس کی بات کے ختم ہونے پر نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تم نہیں جاؤ گی۔" اس کے چہرے کا رنگ میری بات پر بدل گیا تھا۔

"پلیز مجھے جانے دیں، میں نے دو سال محنت کی ہے، میری محنت ضائع ہو جائے گی۔ پلیز مجھے امتحان دینے دیں۔"

پہلی دفعہ اس کا لہجہ التجائیہ تھا۔

"مشعل نے بھی تو بہت محنت کی ہوگی مگر وہ بھی یہ امتحان نہیں دے رہی ہے اور جب وہ یہ امتحان نہیں دے رہی تو تم بھی نہیں دو گی۔"

"میں کبھی آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی، کبھی کوئی شکایت نہیں کروں گی بس صرف میری یہ بات مان لیں مجھے پیپرز دینے دیں۔"

"ایک بار نہیں سو بار نہیں، میں کبھی بھی تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔ نہ آج نہ آئندہ کبھی۔" وہ چند لمحے خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی پھر یک دم رونے لگی۔

"آپ مجھے ایسے جرم کی سزا دے رہے ہیں جو میں نے نہیں کیا۔ میرے لیے میری تعلیم کیا ہے آپ نہیں
جانتے۔"

"میرے لیے مشعل کیا تھی تم تو جانتی تھیں پھر تم نے اسے اور مجھے کس چیز کی سزا دی تھی۔ تعلیم تو کوئی ایسی
شے نہیں ہے جس کے بغیر نہ رہا جا سکے۔ اگر میں مشعل کے بغیر رہ سکتا ہوں تو تم بھی تعلیم کے بغیر رہ سکتی ہو۔"
وہ میری بات پر روتے ہوئے اسٹڈی سے چلی گئی تھی۔ بہت سکون ملا تھا مجھے اس کے آنسوؤں سے۔ یوں
لگا تھا جیسے میرے اندر کی بھڑکتی ہوئی آگ کچھ مدھم ہو گئی تھی۔
پھر امی نے بھی مجھے مجبور کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں اسے امتحان دینے کے لیے لاہور جانے دوں مگر میں
وہ بات کیسے مان سکتا تھا جس سے اسے کوئی relief ملتا، سو میں نے امی کی ساری منت سماجت کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔
وقت آہستہ آہستہ گزرتا جا رہا تھا۔ ہماری شادی کو ایک سال ہونے والا تھا۔ اب اگر کوئی مہرین کو دیکھتا تو
شاید اسے پہچاننے میں بہت دیر لگاتا۔ وہ پہلے سے بہت بدل چکی تھی۔ ملگجے لباس میں ملبوس بکھرے بالوں کے ساتھ وہ
ہر وقت کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی تھی۔ اس کی گندمی رنگت اب زردی مائل ہو چکی تھی۔ وہ پہلے سے بہت کمزور ہو چکی تھی
بعض دفعہ میں اسے بہت غور سے دیکھتا تھا میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ یہ سب کب تک برداشت کرتی ہے؟ کب اس کی
ہمت جواب دے گی اور کب وہ کہے گی کہ اب اور وقت اس گھر میں میں نہیں گزار سکتی؟
مگر عجیب بات تھی کہ وہ ایسا نہیں کہہ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے پتا ہی نہیں لگتا تھا کہ اس کے پاس کچھ
ہے یا نہیں۔

ہماری شادی کو ڈیڑھ سال گزرا تھا جب ایک دن ایک حادثے میں مہرین کی امی کے مرنے کی اطلاع ملی
میں نے امی سے کہا تھا۔

"آپ جانا چاہتی ہیں تو جائیں مگر مہرین نہیں جائے گی۔"
میں چاہتا تھا کہ مہرین روئے، چلائے، مجھ سے جانے کے لیے التجا کرے تب میں اسے جانے دوں مگر اس
نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ امی مجھ سے لڑتی رہی تھیں، مجھے بددعائیں دیتی رہی تھیں، اسے ساتھ لے جانے کے لیے
اصرار کرتی رہی تھیں مگر وہ بالکل چپ تھی۔ اس نے امی سے کہا تھا:
"خالہ آپ اصرار نہ کریں، مجھے کہیں نہیں جانا ہے۔ یہ سب میری سزا ہے مجھے برداشت کرنا ہے آخر میں
نے مشعل کو مارا تھا۔"

"تو تمہیں احساس ہونا شروع ہو گیا کہ تم نے مشعل کو مارا تھا۔" میں نے سوچا۔ امی اکیلی لاہور چلی گئی
تھیں۔ وہاں سے نانی امی نے فون کر کے مجھے کہا تھا کہ میں اسے بھیج دوں سب چاہتے تھے کہ ایک بار وہ اپنی امی کا
چہرہ دیکھ لے پھر ہی انھیں دفن کیا جائے۔ مگر میں نے اسے جانے نہیں دیا۔ اس نے مجھے کہا بھی نہیں۔ پھر میں اس پر
اتنی سخاوت کیوں دکھاتا۔
امی خالہ کے دسویں کے بعد واپس کراچی آئی تھیں اور کتنی ہی دیر وہ اس سے لپٹ کر روتی رہیں مگر اس کی

آنکھوں میں آنسو نہیں آئے وہ انھیں چپ کرواتی رہی جیسے مرنے والی سے صرف امی کا تعلق تھا اس کا نہیں۔

خالہ کے مرنے کے بعد امی نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔ انھیں اگر مجھ سے کوئی کام ہوتا تب بھی وہ میرے بجائے ملازم کو کہتیں۔ میری کسی بات کا جواب وہ نہیں دیا کرتیں اور مجھے اب اس کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ ایک بار میں نے ان کی پروا کی تھی اور تب مشعل زندگی ہار گئی تھی اب کس چیز سے محروم ہوتا میں۔

مجھے یاد ہے اس ماہ جب میں انھیں مہینے کے آغاز میں کچھ روپے دینے گیا تھا تو انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا تھا۔

''نہیں اسود اب مجھے تمہاری کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، اس روپے کا میں نے کیا کرنا ہے۔''

''جو پہلے کرتی تھیں وہی کریں۔'' وہ کتنی دیر بہت عجیب نظروں سے مجھے دیکھتی رہی تھیں۔ مجھے پہلی بار ان کی آنکھوں سے خوف آیا تھا۔ انھوں نے اپنے تکیے کے نیچے سے چابی نکال کر میری طرف اچھال دی۔

''اس الماری کی دراز کھول کر دیکھو کتنا روپیہ بھرا ہے اس میں۔ اوپر سے نیچے تک تمھیں نوٹ ہی نوٹ نظر آئیں گے مگر میں ان نوٹوں کا کیا کروں جو روپیہ خرچ کر سکتی ہے وہ پیسے پیسے کے لیے ترستی ہے۔ میں کوئی زیور، کوئی کپڑا، کوئی چیز اس کے لیے نہیں لا سکتی تو میں اس روپے کا کیا۔'' وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔ میں ان کے کمرے سے باہر آ گیا۔

''مشعل بھی تو خود پر کچھ نہیں خرچ کر سکتی پھر اس پر کسی کو ترس کیوں نہیں آتا کیا صرف اس لیے کہ وہ قبر میں ہے اور جو دوسروں کو قبر میں پہنچا دیتے ہیں ان پر کتنی جلدی رحم آتا ہے لوگوں کو'' میں نے اپنے دل میں سوچا تھا۔

کچھ وقت اور گزر گیا تھا۔ مہرین اب بالکل ایک مشین کی طرح کام کرتی تھی۔ اب وہ خود ہی پورے گھر کا کام کرنے لگی تھی۔ چھٹی کے دن وہ ماربل کے فرش کو دھونے بیٹھتی اور گھنٹوں اسی میں لگی رہتی اگر چیزوں کو صاف کرنے لگتی تو بہت سا وقت اسی میں لگا دیتی۔ میرے جوتے پالش کرنے لگتی تو پوری الماری جوتوں سے خالی کر کے انھیں چمکاتی رہتی۔

ہم دونوں کے درمیان بہت سرسری سی بات ہوتی تھی، وہ بھی صرف اس وقت جب مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوتی تھی۔ ورنہ کئی کئی دن ہم دونوں میں کوئی گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ میں اس سے کوئی بات کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے پاس جھوٹ اور منافقت کے علاوہ اور تھا بھی کیا؟

پھر انھیں دنوں وہ بیمار رہنے لگی تھی۔ شروع میں، میں نے اس بات کی پروا بھی نہیں کی۔ مگر ایک دن وہ صبح اٹھی ہی نہیں۔ سات بجے جب میں اٹھا تو وہ تب بھی اپنی جگہ پر سو رہی تھی۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی۔ پچھلے دو سال میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ میرے جاگنے سے پہلے نہ اٹھ چکی ہو مگر اس دن وہ نہیں اٹھی تب ہی میں نے اسے آواز دی تھی مگر کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ پھر میں نے اسے کتنی بار پکارا تھا مگر تب بھی اس میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی۔

میں نے اس کے پاس جا کر اس کے منہ پر سے کمبل ہٹایا تھا۔ اس کا چہرہ آگ کی طرح سرخ تھا۔

میں نے دوبارہ اسے اٹھانے کی کوشش نہیں کی اور تیار ہو کر آفس چلا گیا۔

شام کو جب میں آفس سے آیا تو امی نے مجھے دیکھتے ہی کہا تھا۔
''مہرین کو نمونیہ ہو گیا ہے۔'' میں نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔
''میں نے ڈاکٹر کو بلایا تھا۔ اس نے کچھ دوائیاں لکھ کر دی ہیں۔ وہ کہتا ہے اسے آرام اور اچھی خوراک کی ضرورت ہے۔'' میں اب بھی چپ رہا تھا۔
''تم کچھ بولتے کیوں نہیں؟''
''کیا بولوں لاکھوں لوگوں کو نمونیہ ہو جاتا ہے اور وہ ٹھیک بھی ہو جاتے ہیں۔ ہاں کچھ مر بھی جاتے ہیں مگر مہرین ان لوگوں میں شامل نہیں، ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ بہت ڈھیٹ ہے اسے تو صرف مارنا آتا ہے۔''
میں یہ کہہ کر بریف کیس اٹھا کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ وہ ابھی بھی سو رہی تھی۔ میں خاموشی سے لباس تبدیل کرنے کے لیے ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔
جب کچھ دیر بعد میں ڈریسنگ روم سے نکلا تھا تو امی اس کے پاس کارپٹ پر سوپ کا پیالہ لیے بیٹھی تھیں۔ وہ اس سے کہہ رہی تھیں:
''تم پیو سوپ میں کون سا اسود سے چوری پلا رہی ہوں اس کے سامنے لے کر آئی ہوں۔ پیو تم تمہیں اس کی ضرورت ہے۔''
''میرا دل نہیں چاہ رہا میں سچ کہہ رہی ہوں میرا کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔'' وہ کمزور سی آواز میں ان سے کہہ رہی تھی۔
میں چند لمحے خاموشی سے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتا رہا پھر میں نے امی سے کہا:
''کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو سوپ کے پیالے یہاں اٹھا کر لانے کی، اسے بھوک لگے گی تو یہ خود کچن میں جا کر کھانا کھا لے گی، آپ اس کی ملازمہ نہیں ہیں اور نہ ہی یہ مر رہی ہے۔''
اس نے میری بات پر کمبل سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔ امی ملامت بھری نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔
پھر روز یہ ہی ہوتا تھا۔ امی اسے کھانے کے لیے اصرار کرتیں اور وہ کھانا کھانے سے انکار کر دیتی۔ اگر کھاتی بھی تو صرف وہی چیزیں جو وہ پہلے کھایا کرتی تھی۔
''ہاں بہت خوددار ہو تم مہرین بہت خوددار ہو، تم کہاں کوئی بددیانتی کر سکتی ہو چاہے وہ چند پھلوں کی ہو یا سوپ کے پیالے کی۔ مگر مجھ پر تمہارے ان ڈراموں کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔''
میں اسے دیکھ کر سوچا کرتا تھا۔
اسے ٹھیک ہونے میں ایک ماہ لگ گیا تھا اور ٹھیک ہونے کے بعد وہ ایک بار پھر اپنی روٹین پر واپس آ گئی تھی۔ مگر اب وہ پہلے سے بھی زیادہ کمزور ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اب بہت نمایاں ہو گئے تھے اور اس کے چہرے کی ہڈیاں زیادہ ابھر آئی تھیں۔

انہی دنوں میں مجھے اپنی کمپنی کی طرف سے امریکا جانا پڑا تھا۔ دو ماہ کے لیے مجھے وہاں رہنا تھا اور ابھی مجھے وہاں آئے صرف ایک ہفتہ ہوا تھا کہ مجھے اچانک امی کے انتقال کی خبر ملی تھی۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ میں تو انھیں بالکل صحیح سلامت چھوڑ کر آیا تھا۔ پھر انھیں اچانک کیا ہو گیا؟

میں نے فوراً واپس آنے کے لیے فلائٹ کی تلاش شروع کر دی مگر مجھے جس فلائٹ میں سیٹ مل رہی تھی وہ پانچ دن کے بعد کی تھی۔ پانچ دن کے بعد جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ میں ان کا چہرہ نہ دیکھ پاتا۔ میں نے دوسرے دن کی فلائٹ میں سیٹ حاصل کرنے کے لیے بے انتہا کوشش کی تھی مگر میں ناکام رہا۔ فون پر روتے ہوئے میں نے بڑے ماموں کو امی کو دفنانے کی اجازت دے دی تھی۔

اور اس رات جب میں امی کو یاد کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا تو مجھے یاد آیا تھا کہ میں نے مہرین کو بھی اس کی امی کا چہرہ دیکھنے نہیں دیا تھا اور جب میں اسے لاہور جانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا تو امی نے روتے ہوئے مجھے کہا تھا۔

''کل کو جب میں مر جاؤں گی تو پھر خدا تمھیں بھی میرا چہرہ دیکھنے نہیں دے گا۔ یہ کیوں بھول رہے ہو؟ اسود اتنا ظلم نہ کرو کہ تمھارے ساتھ ساتھ میری بھی بخشش نہ ہو۔''

اور میں ان کی بات یاد آنے پر یک دم ساکت ہو گیا تھا۔ ہاں واقعی ان کی بات سچ ثابت ہو گئی تھی۔ میں بھی ان کا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا۔

پانچ دن کے بعد جب میں کراچی آیا تھا۔ تو گھر میں ایک عجیب سی ویرانی تھی، نانی اماں اور ماموں ابھی یہیں تھے مگر پھر بھی لگتا تھا جیسے گھر میں کوئی نہیں ہے۔ امی کے دسویں تک سب لوگ یہیں رہے تھے پھر سب واپس چلے گئے تھے۔ مشعل کی امی بھی امی کی موت پر آئی تھیں۔ انھوں نے مجھ سے تعزیت کی تھی اور مجھے دلاسا بھی دیا تھا لیکن مہرین سے انھوں نے کوئی بات نہیں کی۔

پھر جتنے دن وہ یہاں رہیں، مہرین اور وہ، دونوں ایک دوسرے کو نظر انداز کرتی رہیں مگر اکبر ماموں مہرین کے ساتھ نارمل طریقے سے ملے تھے، مجھے لگا تھا جیسے انھیں ماضی بھول چکا تھا ورنہ وہ کیسے مہرین سے اس طرح مل سکتے تھے۔

دسویں کے بعد ایک دن میں امی کے کمرے میں گیا تھا۔ میں نے امی کی الماری کھولی تھی اور وہاں رکھے ہوئے کاغذات دیکھنے لگا اس میں لاہور کے گھر اور زمینوں کے کاغذات تھے اور میں ان کاغذات کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا تھا۔ انھوں نے وہ گھر اور زمینیں مہرین کے نام کر دی تھیں۔ اپنا ایک اکاؤنٹ بھی انھوں نے اس کے نام ٹرانسفر کر دیا تھا۔ لاہور میں موجود دو پلاٹ انھوں نے میرے نام کر دیے تھے اور باقی سارے اکاؤنٹس اور لاکرز بھی انھوں نے میرے نام چھوڑے تھے۔

میں خاموشی سے کاغذات کو دیکھتا رہا۔ پھر میرے ہاتھ ایک لفافہ آیا تھا۔ میں نے اسے کھول لیا۔ وہ خط میرے نام ہی تھا میں بھیگی آنکھوں سے اسے پڑھنے لگا:

''میرے پیارے بیٹے اسود علی!

یہ خط جب تمھیں ملے گا تب میں زندہ نہیں رہوں گی پچھلے کچھ عرصہ سے مجھے لگ رہا ہے جیسے اب میری زندگی کے دن بہت تھوڑے رہ گئے۔ دل میں آیا کہ پتا نہیں آخری وقت میں تم سے بات بھی کر سکوں گی یا نہیں۔ اس لیے سوچا کہ تمھارے نام ایک خط لکھ دوں۔ شاید جو بات میری زبان تمھیں نہیں سمجھا سکی، میری تحریر سمجھا دے، مجھے اب موت سے خوف نہیں آ رہا بلکہ اس کا تصور کر کے عجیب سا سکون ملتا ہے۔ جو زندگی میں گزار رہی ہوں اس سے موت بہرحال بہتر ہے۔ زندہ رہ کر مجھے کیا دیکھنا ہے، مہرین کو جس کی زندگی میں نے تباہ کر دی یا تم کو جو اپنی زندگی خود برباد کر رہے ہو؟

اسود تم تو اعلیٰ ظرف تھے، بہت بڑے دل کے مالک تھے، تم تو لوگوں کو معاف کر دیا کرتے تھے پر اب تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ میں نے تو تمھیں بدلہ لینا کبھی نہیں سکھایا تھا تم یہ سب کہاں سے سیکھ گئے۔ یہ بغض یہ تنگ دلی، یہ بدلہ لینے کا جذبہ، یہ سب تم میں کہاں سے آ گیا ہے؟ یہ میری تربیت تو نہیں تھی۔

جانتی ہوں میں نے تمھیں بھی بہت تکلیف پہنچائی ہے۔ یہ سب میری ضد کا نتیجہ ہے پر اس ایک غلطی کی اتنی بڑی سزا ملے گی یہ مجھے پتہ نہیں تھا۔ میں پچھتا رہی ہوں۔ بہت پچھتا رہی ہوں مگر میں نہیں چاہتی کہ پچھتاوے تمہارا مقدر بھی بنیں۔ مہرین کو معاف کر دو۔ وہ اتنی سزا کی مستحق نہیں ہے۔

مشعل تو مر چکی ہے وہ کبھی واپس نہیں آئے گی مگر جو زندہ ہے، تم اسے مت مارو اسے معاف کر دو، یہ تم سے میرا آخری مطالبہ ہے اگر یہ پورا کر دو گے تو زندگی میں نہیں مگر مرنے کے بعد میں سکون سے رہوں گی۔

امید کرتی ہوں تم اپنی ماں کی یہ آخری خواہش ضرور پوری کر دو گے۔

خدا تمھیں ہمیشہ اپنی امان میں رکھے۔

تمہاری ماں''

پتا نہیں میں نے کتنی بار اس خط کو پڑھا اور کتنی ہی دیر میں وہاں بیٹھا رہا پھر امی کی الماری بند کرنے کے بعد میں کاغذات لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ ملازم کو میں نے مہرین کو بھیجنے کے لیے کہا۔ وہ تھوڑی دیر بعد آئی اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کاغذات اس کی طرف بڑھا دیے۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے انھیں نہیں پکڑا تھا۔

''امی نے لاہور والا گھر اور زمین تمھارے نام کر دی تھی یہ اسی کے کاغذات ہیں۔''

''مگر مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔''

''بہرحال یہ تمھارے ہیں چاہے تمھیں ان کی ضرورت ہے یا نہیں۔'' میں نے ان پیپرز کو ٹیبل پر پھینکتے ہوئے کہا تھا۔ وہ خاموش رہی۔

''بیٹھ جاؤ۔'' میں نے اسے کہا وہ حیرانگی سے مجھے دیکھتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی۔

''جب میں نے تم سے شادی کی تھی تو میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ساری زندگی میں تمھیں سکون نہیں دوں گا،

تمھیں کچھ بھی نہیں دوں گا لیکن میری ماں کی آخری خواہش یہ ہے کہ میں تمھیں معاف کر دوں۔ سومہرین میں تمھیں معاف کرتا ہوں۔ حالانکہ یہ میرے لیے بہت مشکل ہے۔ میرے دل میں تمھارے لیے نفرت کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے پھر بھی میں تمھیں معاف کرتا ہوں۔ جو پابندیاں میں نے تم پر لگائی تھیں وہ آج سے ہٹا رہا ہوں۔ اب تمھیں حق دے رہا ہوں کہ تم جو چاہے کرو، جیسے چاہو ویسے رہو، جس سے چاہو ملو۔''

وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ مجھے کچھ دیر دیکھتی رہی پھر اس نے کہا:

''لیکن مجھے معافی نہیں چاہیے۔ میں جیسے رہ رہی ہوں، میں خوش ہوں، میں ایسے ہی رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سزا میرے لیے ٹھیک ہے۔ بہت مناسب ہے۔ اب مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے۔''

میں کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

''میں نے کہا نا تم جیسے چاہو رہ سکتی ہو، تم آزاد ہو۔'' وہ میری بات ختم ہونے پر اٹھ کر کمرے سے چلی گئی تھی۔

مشعل ٹھیک کہتی تھی میں کہاں بہادر ہوں۔ میں تو بہت بزدل ہوں۔ جو بھی کہتا ہوں وہ نہیں کر پاتا۔ ایک بار پھر میں نے امی کی آخری خواہش کو مشعل کی آخری خواہش پر ترجیح دی تھی اور میں پھر بھی کہتا تھا کہ مجھے مشعل سے محبت ہے۔

مہرین نے اپنی روٹین نہیں بدلی تھی۔ وہ اسی طرح رہتی تھی جیسے وہ پہلے رہتی تھی۔ پہلے کی طرح وہ اپنا کھانا الگ پکاتی تھی۔ انہی کپڑوں میں ملبوس رہتی تھی جو وہ پہلے پہنتی تھی۔ اسی طرح کارپٹ پر سویا کرتی تھی۔ ویسے ہی سارا دن گھر کا کام کرتی رہتی تھی اور اگر کسی جگہ بیٹھ جاتی تو کئی کئی گھنٹے وہیں بیٹھی رہتی۔

میں نے اس کی کسی حرکت پر اعتراض نہیں کیا تھا میں اب ایسا کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ پھر ڈھائی سالوں میں پہلی بار میں نے اسے جیب خرچ کے لیے کچھ رقم دینے کی کوشش کی تھی۔

''لیکن مجھے ان روپوں کی ضرورت نہیں ہے۔'' پتا نہیں وہ روپے دیکھ کر کیوں خوفزدہ ہوگئی تھی۔

''جب ضرورت پڑے تب انھیں خرچ کر لینا۔'' میں نے روپے اس کے ہاتھ میں تھما دیے تھے۔

وہ عجیب نظروں سے انھیں دیکھتی رہی۔ پھر وہ کتنی دیر انھیں مٹھی میں لے کر صوفے پر بیٹھی رہی۔

اس رات میں اسٹڈی میں بیٹھا کچھ فائلیں دیکھ رہا تھا۔ جب اچانک مجھے کافی کی طلب ہونے لگی تھی۔ ملازم دو گھنٹے پہلے مجھے کافی دے کر گیا تھا اور عام طور پر میں رات کو کافی کا صرف ایک کپ ہی پیا کرتا تھا مگر اس رات مجھے بہت کام کرنا تھا۔ اس لیے میں کافی بنانے کے لیے خود کچن میں چلا گیا۔

ملازم اس وقت اپنے کوارٹرز میں جا چکے تھے مگر کچن کی لائٹ آن تھی۔ مجھے یاد آیا کہ مہرین اس وقت کچن میں ہوگی۔ وہ رات کو کچن خود صاف کرنے کے بعد ہی کمرے میں جایا کرتی تھی۔ میں نے سوچا کہ میں اسے کافی بنانے کے لیے کہہ دوں گا۔ میں کچن میں داخل ہوا تو پہلی نظر میں وہ مجھے وہاں نظر نہیں آئی۔ مگر گردن گھمانے پر وہ مجھے نظر آ گئی تھی۔

ڈائننگ ٹیبل کے دوسری طرف وہ دیوار سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔

میں دبے قدموں سے اس کی طرف گیا تھا وہ کچھ بولتے ہوئے فرش پر انگلی سے کچھ لکھ رہی تھی۔ لکھتے لکھتے رک کر وہ دوسرے ہاتھ سے جیسے اپنی لکھی ہوئی تحریر کو مٹا رہی تھی۔ کبھی وہ لکھتے لکھتے رک کر اپنی دائیں جانب دیکھ کر یوں بات کرنے لگتی جیسے وہاں اس کے پاس کوئی بیٹھا ہوا ہو۔ پھر بات کرتے کرتے وہ مسکرائی اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

میں اس کی باتیں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ وہ مدھم آواز میں بات کر رہی تھی۔ میں بہت دیر تک وہیں کھڑا رہا مگر اسے احساس نہیں ہوا کہ میں اس کے پاس کھڑا ہوں۔ وہ اسی طرح فرش پر لکھتی، مٹاتی، دائیں جانب دیکھ کر باتیں کرتی رہی۔ میں بے یقینی کے عالم میں وہاں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اسے آواز دی تھی۔

پہلی آواز پر وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوئی مگر دوسری آواز پر وہ یک دم ہڑبڑا گئی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا اور پھر فق چہرے کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

مجھے فوری طور پر کچھ سمجھ نہیں آیا کہ میں اسے کیا کہوں، اس سے کیا پوچھوں۔

''مجھے کافی چاہیے۔'' کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد میں نے اسے کہا تھا۔

وہ سر ہلا کر خاموشی سے کوکنگ رینج کی طرف بڑھ گئی۔ مجھے حیرت ہوئی تھی وہ پانی بوائل کرنے کے لیے کافی میکر کی طرف نہیں گئی تھی۔ میں وہیں کھڑا بازو لپیٹے اسے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ دیر معنی خیز انداز میں کوکنگ رینج کو آن آف کرتی رہی پھر وہ مڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی۔

''مجھے کافی چاہیے۔'' اس بار میں نے بلند آواز میں کہا تھا اور اس بار وہ سر ہلا کر کافی میکر کی طرف ہی گئی تھی۔ اسے نکال کر وہ سوئچ بورڈ کے پاس slab پر لے گئی تھی۔ پھر کچھ دیر تک وہ جیسے یاد کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ اسے کیا کرنا تھا۔ پھر وہ sink کے پاس لگے فلٹر سے پانی لینے کی بجائے فریج کے پاس گئی تھی اور وہیں سے اس نے پانی کی بوتل نکال لی تھی پھر اس نے اس بوتل سے کافی میکر میں پانی انڈیلا تھا۔ اس نے کافی میکر کو پانی سے تقریباً بھر دیا تھا۔ پھر اس نے کافی کا جار اور ایک کپ لا کر ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیا۔ مگر اس نے کافی میکر کو آن نہیں کیا اور اس کے پاس کھڑی رہی۔

''مہرین تم نے کافی میکر کا سوئچ آن نہیں کیا۔''

اس نے میری ہدایت پر فوراً سوئچ بورڈ پر لگا سوئچ آن کر دیا تھا۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس نے کافی میکر کا پلگ بھی ابھی تک ساکٹ میں نہیں لگایا تھا۔

''رہنے دو مجھے کافی نہیں چاہیے۔'' میں اسے یہ کہہ کر کچن سے واپس آ گیا تھا۔ وہ غائب دماغی کی حالت میں تھی اور ایسا میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔

اسٹڈی میں آ کر میں کافی دیر تک پریشانی کے عالم میں بیٹھا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ میرے ذہن سے فائلیں نکل چکی تھیں۔ کافی دیر تک اسٹڈی میں بیٹھے رہنے کے بعد میں جب اپنے کمرے میں آیا تو وہ سو چکی تھی۔ میں بھی خاموشی سے بیڈ پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا صبح وہ بالکل نارمل تھی۔ میں اس کی

ہر حرکت کو بڑے غور سے دیکھتا رہا مگر اس کے کسی بھی کام میں رات والی غائب دماغی کی جھلک نہیں تھی۔ وہ اسی طرح کام کر رہی تھی جس طرح پہلے کیا کرتی تھی۔

میں کافی مطمئن ہو کر آفس گیا تھا۔ شاید وہ ایک وقتی کیفیت تھی، میں نے خود کو تسلی دی تھی۔ مگر وہ وقتی کیفیت نہیں تھی، وہ جب بھی اکیلی ہوتی تھی، وہ خود سے باتیں کرنا شروع ہو جاتی تھی۔ یا اگر خاموش بیٹھی ہوتی تو کئی کئی گھنٹے وہ ایک ہی چیز پر نظر جمائے بیٹھی رہتی۔ پھر یک دم اسے چیزیں بھولنے لگی تھیں۔ وہ سامنے رکھی ہوئی چیز کو بھی تلاش نہیں کر پاتی تھی اور اسے کونے کھدروں میں ڈھونڈتی رہتی تھی۔

میری پریشانی میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے معاف کر دینے سے پہلے اگر اس کا یہ حال ہوتا تو میں بہت خوش ہوتا، بہت سکون ملتا مجھے کیونکہ یہی مکافات عمل تھا مگر اب اسے اس حالت میں دیکھ کر مجھے خوشی نہیں ہوئی تھی۔ میں اب اسے مصروف رکھنے کے لیے کسی نہ کسی بہانے اسے مخاطب کرتا رہتا تھا۔ تا کہ اس کا ذہن مصروف رہے۔

پھر ایک دن میں اس کے لیے کچھ کپڑے لے کر آیا تھا اور میں نے اسے کہا تھا کہ وہ ان میں سے کوئی لباس پہن لے۔ اس نے خاموشی سے میرے حکم کی تعمیل کی تھی اور ایک لباس بدل کر آ گئی۔ ڈھائی سال بعد پہلی بار اس نے کوئی نیا لباس پہنا تھا۔ پھر مجھے اسے کچھ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ وہ پتا نہیں کہاں سے کچھ زیور نکال لائی تھی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر انھیں پہننے لگی۔ انھیں پہننے کے بعد وہ برش سے اپنے بال سلجھانے لگی تھی۔ یک دم جیسے وہ کمرے میں میری موجودگی سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ وہ بس بالوں میں برش کرتے ہوئے آئینے میں اپنے عکس کو دیکھے جا رہی تھی۔

پھر پتا نہیں کیا سوچ کر اس نے باری باری وہ زیورات اتار دیے اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے اٹھ کھڑی ہوئی میں نے اسے کہا تھا۔

''انھیں کیوں اتار دیا پہنی رہتیں۔''

اس نے ایک نظر زیورات کو دیکھا پھر میری طرف دیکھ کر کہا:

''زیورات تو صرف مشعل کو اچھے لگتے ہیں۔''

کسی نے میرے سینے میں خنجر گاڑ دیا تھا۔ میں تیزی سے دروازہ کھول کر کمرے سے نکل آیا۔

''مشعل کو تو سب کچھ اچھا لگتا تھا سب کچھ۔'' لاؤنج میں آ کر میں نے سوچا تھا۔

............❀............

اس رات میری کمپنی کی annual get together ہو رہی تھی۔ فنکشن couples کے لیے تھا۔ پتا نہیں کیا سوچ کر میں نے اسے ساتھ چلنے کے لیے کہہ دیا۔ جب وہ تیار ہو کر میرے سامنے آئی تھی تو کچھ دیر کے لیے میں اسے دیکھ کر حیران ہو گیا تھا۔ وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ شاید میں نے شادی کی رات کے بعد پہلی دفعہ اسے میک اپ میں دیکھا تھا۔

فنکشن میں پہنچنے تک ہم میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ فنکشن میں تقریباً سب ہی لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ تھے۔ وہ اس چمک دمک کے سامنے بہت ماند ہوگئی تھی۔ شاید وہ زندگی میں پہلی بار اتنے بڑے فنکشن میں آئی تھی۔ اس لیے نروس تھی۔

میں نے اپنے کچھ دوستوں، کولیگز اور باس سے اس کا تعارف کروایا تھا۔ وہ ایک بہت ہی نروس سی مسکراہٹ کے ساتھ ان سے ملی تھی۔ فنکشن میں چیف گیسٹ کے طور پر ایک وفاقی وزیر کو بلوایا گیا تھا اور ان کی فارمل speech کے بعد کچھ گیمز کروائے گئے تھے جن میں کمپنی کے کچھ لوگوں نے اپنی بیویوں کے ساتھ شرکت کی تھی۔

میں خاموشی سے سوفٹ ڈرنک کے سپ لیتا ہوا اپنی ٹیبل پر کچھ دوسرے کولیگز کے ساتھ بیٹھا اس ہنگامے کو دیکھتا رہا۔ ڈنر شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے فنکشن کے چیف آرگنائزر جاوید احمد میری طرف آئے تھے۔

''سر آپ اور آپ کی مسز کی سیٹ change کر دی گئی ہے اب آپ منسٹر صاحب والی ٹیبل پر بیٹھیں گے اس لیے پلیز میرے ساتھ آ جائیں۔''

میں اس کی بات پر بے حد حیران ہوا تھا ایک دم اتنی بڑی نوازش کس لیے کی گئی تھی مجھ پر؟ یہ میں سمجھ نہیں پایا۔ اپنی کمپنی کے جی۔ ایم اور منسٹر آف انفارمیشن کے ساتھ ایک ٹیبل پر ڈنر کرنا یقیناً اعزاز کی بات تھی۔

میں اور مہرین جاوید کے ساتھ چل پڑے تھے۔ ان کی ٹیبل کی طرف جاتے ہوئے میں نے جی ایم اور منسٹر کو اپنی طرف ہی دیکھتے پایا۔ جب ہم ان کی ٹیبل کے پاس پہنچے تو منسٹر اپنی کرسی سے کھڑے ہو گئے۔

''دیکھ لیں مہرین میں نے آپ کی ایک غلط فہمی تو دور کر دی ہے کہ ہم سیاستدان صرف الیکشنز کے دنوں میں لوگوں کو پہچانتے ہیں۔ سال کے باقی گیارہ مہینے ہماری یادداشت خراب رہتی ہے مگر مجھے نہ صرف آپ کا چہرہ یاد ہے بلکہ آپ کا نام بھی۔'' وہ مہرین سے مخاطب ہوئے تھے میرے سر پر جیسے حیرت کا پہاڑ گر پڑا تھا۔

"She is the most out spoken, straight forward and the wittiest girl I ever came across in my life."

منسٹر صاحب نے جن الفاظ میں اس کا تعارف ہمارے جی ایم کرنیلسن شیفل سے کیا تھا انھوں نے مجھے مزید گنگ کر دیا تھا۔

"Oh really! seems interesting"

ہمارے جی ایم نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ میں نے مہرین کو دیکھا وہ اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ کھڑی تھی۔

''آپ ان کے شوہر ہیں؟''

منسٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

''یس سر میرا نام اسود علی ہے۔''

''ہاں جانتا ہوں چند لمحے پہلے آپ کے جی ایم نے ہی آپ کے بارے میں بتایا ہے، پلیز بیٹھیے۔''

انھوں نے مجھ سے بات کرتے کرتے اچانک مہرین کو مخاطب کیا تھا۔ مہرین کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ ہم دونوں

بھی اس کی پیروی کی۔

"Why did you stop writing for the newspaper?"

انھوں نے بیٹھتے ہی مہرین سے پوچھا تھا۔
میں نے پھر چونک کر اسے دیکھا۔ آج کا دن شاید انکشافات کا دن تھا۔

"I lost interest in it".

"So what are you doing these days?"

"Nothing. I'm a housewife."

مہرین نے دھیمی آواز میں کہا تھا۔
میں نے پہلی بار اسے انگلش بولتے سنا تھا۔
''کیوں اسود صاحب آپ ان کا ٹیلنٹ کیوں ضائع کر رہے ہیں؟''
میرا جواب سننے سے پہلے ہی منسٹر صاحب نے اچانک ہمارے جی ایم سے کہا:

"Why don't you employ her with your company as a public relations officer? She would do wonders."

"I assure you."

"I'm not interested."

مہرین نے ہمارے جی۔ ایم کے کچھ کہنے سے پہلے منسٹر صاحب کی آفر رد کر دی تھی۔
''ٹھیک ہے جیسے آپ چاہیں مگر پھر بھی آپ جیسے لوگوں کو خدا گھر بیٹھ کر ضائع ہونے کے لیے نہیں بناتا۔''
وہ ان کی بات پر چپ ہی رہی تھی۔ گفتگو کا سلسلہ ایک بار پھر منسٹر صاحب نے ہی جوڑا تھا۔ ڈنر کے دوران بھی ان دونوں کے درمیان بات چیت ہوتی رہی۔ اگرچہ زیادہ باتیں منسٹر ہی کرتے رہے۔ میں خاموشی سے اس سارے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔
مجھے حیرت ہوئی تھی جب انھوں نے کہا تھا کہ وہ مہرین کے فین ہیں۔ وہ سب مہرین کی بات کر رہے تھے۔ کیا میرے ساتھ بیٹھی مہرین وہی تھی وہ اس کی جن خوبیوں کو سراہ رہے تھے کیا وہ اس میں تھیں؟ میرا دماغ سوالوں میں الجھا ہوا تھا۔
ڈنر کے بعد فنکشن سے جانے سے پہلے منسٹر نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ اپنے دستخط کے ساتھ یہ کہہ کر دیا تھا کہ انھیں ہمارا کوئی بھی کام کر کے خوشی ہوگی۔
اس رات فنکشن سے واپسی پر میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ وہ منسٹر مہرین سے ایک بار کالج میں ملے تھے۔ کس حیثیت میں؟ کیا صرف ایک بار ملنے پر ویسی بے تکلفی ہو سکتی ہے جیسی وہ ظاہر کر رہے تھے؟ مہرین کے فین کیوں تھے وہ اس کی کن صفات کا بار بار تذکرہ کر رہے تھے؟ میں نے گھر آ کر مہرین سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ مجھے اس کی

ضرورت نہیں تھی۔ کپڑے چینج کرنے کے بعد میں بیڈ پر آ کر لیٹ گیا تھا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جیولری اتارنے بیٹھی تھی مگر جیولری اتارنے کے بعد بھی وہ وہیں بیٹھی رہی۔ وہ مسلسل آئینے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

میں کچھ دیر تک اس کے اٹھنے کا انتظار کرتا رہا مگر جب کافی دیر تک وہ اسی حالت میں بے حس حرکت وہاں بیٹھی رہی تو میں نے اس کا نام پکارا مگر وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوئی میں نے دوبارہ اس کا نام لیا مگر اس نے تب بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ میں اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ بہت اچانک اس کے جسم میں حرکت ہوئی تھی پھر اس نے آئینے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا پھر اپنا ہاتھ اس طرح عکس پر پھیرنا شروع کر دیا جیسے وہ اسے محسوس کرنا چاہ رہی ہو پھر اس نے اپنا دوسرا ہاتھ بھی آئینے پر رکھ دیا وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

''مہرین، مہرین؟''

میں نے ایک بار پھر اسے بلایا تھا مگر وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ پہلی دفعہ میری موجودگی میں وہ خود سے باتیں کرنا شروع ہو گئی تھی ورنہ اس سے پہلے وہ صرف اکیلے میں ایسا کرتی تھی۔ میں بیڈ سے اٹھ کر اس کے پاس چلا گیا۔ اس کے چہرے کی کیفیت نارمل نہیں تھی۔ چند گھنٹے پہلے کی مہرین نہیں تھی وہ۔ میں نے اس کے بازو کو پکڑ کر اسے زور سے جھنجھوڑا تھا۔ یک دم وہ جیسے کسی جادو کے اثر سے باہر آ گئی تھی۔ میں الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

''کیا کر رہی تھیں تم؟'' میں نے اس سے پوچھا تھا۔

اس نے پلٹ کر ایک نظر آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا پھر اُلجھی ہوئی نظروں سے ایسے مجھے دیکھا جیسے وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا کر رہی تھی۔

''میں......'' وہ ایک لفظ کہہ کر سوچ میں پڑ گئی تھی۔

''جاؤ کپڑے بدلو۔'' میں بے دلی سے اسے کہہ کر واپس اپنے بیڈ پر آ گیا تھا۔

وہ کچھ دیر وہاں کھڑے رہنے کے بعد ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

''مجھے اسے کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھانا چاہیے۔'' میں نے پہلی بار اس کی اس حالت کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا تھا۔

مگر اس سے پہلے کہ میں اسے کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھا پاتا ایک اور عجیب واقعہ ہوا تھا۔ اس فنکشن کے چند دن بعد لاہور سے میرے ایک دوست کا چھوٹا بھائی اپنے ایک کاروباری معاملے کے سلسلے میں مجھ سے ملنے آیا تھا۔ آفس میں اس معاملے پر بات چیت کرنے کے بعد میں نے اسے لنچ پر گھر انوائیٹ کیا تھا۔

اس دن خانساماں چھٹی پر تھا اور ملازم کچھ سامان لینے گیا ہوا تھا۔ میں نے مہرین کو چائے تیار کر کے لانے کے لیے کہا آدھ گھنٹے بعد جب وہ چائے کی ٹرالی کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی تو عدنان اسے دیکھ کر یک دم کھڑا ہو گیا تھا۔

''مہرین آپ؟''

اس کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ مہرین نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

''سوری میں آپ کو نہیں جانتی۔'' اس نے ٹرالی پاس لاکر کھڑی کرتے ہوئے کہا۔

''میں عدنان ناصر ہوں آپ کا کلاس فیلو۔''

وہ اسے دیکھے بغیر چائے بناتے ہوئے بولی تھی۔

''مجھے یاد نہیں ہے۔'' عدنان اس کی بات پر کچھ خجل ہو گیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں بالکل خاموشی تھی عدنان شرمندہ سا ہو کر بیٹھ گیا تھا اور وہ کچھ عجلت میں چائے بنا رہی تھی۔ یوں جیسے وہ جلد از جلد وہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہو۔

میں خاموشی سے صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ چائے سرو کرنے کے بعد باہر چلی گئی تھی۔

''آپ مہرین کے کلاس فیلو ہیں؟'' میں نے عدنان سے پوچھا تھا۔

''ہاں میں ان کا کلاس فیلو تھا۔'' وہ کچھ کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔

''پھر اس نے آپ کو پہچانا کیوں نہیں؟''

''پتا نہیں شاید میری شکل پہلے سے بہت بدل گئی ہے اس لیے۔ آپ سے کیا رشتہ ہے مہرین کا؟''

''میری بیوی ہے۔'' اس کے چہرے پر ایک رنگ سا لہرایا تھا کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔

''بہت لکی ہیں آپ۔''

''کیوں؟''

''مہرین آپ کی بیوی ہیں اس لیے، یہ ہماری یونیورسٹی کی سپر اسٹار تھی۔ آدھی یونیورسٹی ان کی فین تھی۔ بہت ٹیلنٹڈ تھیں بہت زبردست Personality تھی ان کی میں بھی ان کے Admirers میں سے ہوں اور ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا کوئی بندہ آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو مہرین سے ملا ہو اور ان سے امپریس نہ ہو۔''

میں حیرت سے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا وہ کیا کہہ رہا تھا۔

''مگر مہرین نے تو کبھی کسی Activity میں حصہ نہیں لیا وہ تو بہت Shy اور reserved ہوتی تھی یونیورسٹی میں۔'' اس پر وہ حیران ہوا تھا۔

''نہیں وہ تو یونیورسٹی کی سب سے پر اعتماد لڑکی تھی اور ایسی کوئی Activity نہیں تھی جس میں اس نے حصہ نہ لیا ہو۔''

اسے کوئی بہت بڑی غلط فہمی تھی میں نے اسے کہا۔

''نہیں مہرین یہ کام نہیں کرتی تھی ہاں میری ایک اور کزن تھی مشعل وہ بہت Outstanding تھی ان چیزوں میں۔''

''ہاں مہرین کی ایک کزن مشعل تھی جس کی ڈیتھ ہو گئی تھی اور ہم لوگ تعزیت کے لیے گئے بھی تھے ان کے گھر مگر مجھے یاد نہیں ہے کہ انہوں نے کسی قسم کی سرگرمی میں حصہ لیا ہو ویسے ہو سکتا ہے کبھی حصہ لیا بھی ہو پر مجھے یاد نہیں

ہے۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں مشعل یونیورسٹی کے میگزین کی ایڈیٹر تھیں۔"

وہ الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"مہرین ایڈیٹر تھیں مشعل تو نہیں تھیں آپ پوچھ سکتے ہیں مہرین سے بلکہ میرے پاس تو میگزین کی چند کاپیز بھی ہیں۔ مجھے یاد ہے وہاں بھی ایڈیٹر کا نام مہرین ہی لکھا ہے۔"

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ کہیں کوئی چیز غلط تھی مگر کیا۔

"اور لٹریری سوسائٹی کی پریذیڈنٹ؟"

"ہاں وہ بھی مہرین تھیں بلکہ ڈیبیٹنگ سوسائٹی کی بھی چند اور بھی ایسی سوسائٹیز اور کلب تھے جنہیں مہرین ہی Preside کرتی تھیں۔ بہت ہولڈ تھا ان کا ہر چیز پر۔"

میرے سر پر کسی نے بہت بڑا پہاڑ گرا دیا تھا۔ میں کچھ بول نہیں پایا وہ خاموشی سے چائے پیتا رہا اور میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"اسے یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں نے خود کو تسلی دی تھی اور اس کے جانے کے بعد میں واپس کھانے کی ٹیبل پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ مہرین وہاں سے برتن اٹھا رہی تھی، میں اس کا چہرہ دیکھنے لگا، میں نے عدنان کی باتوں کی تصدیق کروانا چاہی تھی اس سے مگر اس کا ایک ہی جواب تھا۔

"مجھے یاد نہیں ہے مجھے بھلا اتنی پرانی بات کیسے یاد رہ سکتی ہے؟"

اسے ڈھائی تین سال پہلے کی باتیں یاد نہیں تھیں، اسے کیا یاد تھا؟

............❀............

22-2-1983

"آج میں بہت اداس ہوں، آج اسود تعلیم کے سلسلے میں باہر چلا گیا ہے۔ وہ میرا سب سے اچھا دوست تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اب میں کیا کروں گی، صرف وہی تھا جو میری بات غور سے سنتا تھا، جو مجھے بالکل ٹھیک مشورے دیا کرتا تھا، جو مجھ سے ہمدردی کرتا تھا مگر مجھ پر ترس نہیں کھاتا تھا اور تو کوئی ایسا نہیں ہے جو مجھے اس کی طرح سمجھتا ہو، پتا نہیں مجھے کیوں لگتا ہے جیسے وہ میرے بارے میں بنا بتائے سب کچھ جانتا ہے، میں کیا سوچتی ہوں، میں کیا چاہتی ہوں، میرے دل میں کیا ہے، میں کیوں خوش ہوں، میں کیوں اداس ہوں؟ مجھے لگتا ہے جیسے اسے سب پتا ہوتا ہے، اور اب سے نہیں، شروع ہی سے، مجھے اس کے بارے میں یونہی لگتا تھا۔

مجھے یاد ہے بچپن میں، میں اس سے بہت ڈرتی تھی، اپنی ساری کزنز کی طرح کیونکہ اس کے جسم پر بھی بہت مہنگے کپڑے ہوتے تھے۔ وہ بہت خوبصورت تھا میرے سب کزنز کی طرح اور میں...... میں تو بہت بری ہوتی تھی۔ امی ہمیشہ بچے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑے جوڑ کر اپنی طرف سے بہت ڈیزائننگ کر کے میری فراک بناتی تھیں۔ مگر وہ فراک میرے کزنز کے کپڑوں کے سامنے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا مجھے یوں لگتا تھا جیسے اس فراک کے ہر کونے میں یہ لکھا

ہے کہ میں بچا ہوا کپڑا ہوں۔
امی کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے کہ وہ میرے لیے کوئی اچھا جوتا ہی خرید لیں۔ ویسا جلتی بجھتی لائٹوں والا جوتا جیسے اسود اور میری کزنز پہنتی تھیں، وہ تو بس میرے لیے پانچ روپے والی چپل ہی خرید سکتی تھیں پر امی کے پاس تو اپنے لیے بھی جوتا خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے میں ضد بھی نہیں کرتی تھی۔
جب بھی نانی کے گھر جانا ہوتا امی میرے بالوں کو اچھی طرح کپڑے دھونے والے صابن سے دھوتیں اور پھر چھوٹی سی چٹیا بنا دیتیں۔ جب ہم نانی کے گھر آتے تو اپنی کزنز کے کھلے ہوئے چمکدار خوشبو سے مہکتے ہوئے بالوں کو دیکھ کر میں سوچتی کہ امی میرے بالوں کو شیمپو سے کیوں نہیں دھوتیں اسی لیے تو یہ اتنے برے لگتے ہیں۔
مجھے کبھی بھی نانی کے گھر جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ کیونکہ وہاں جو لوگ رہتے تھے وہ ہم سب سے بہت برتر تھے۔ مالی لحاظ سے بھی اور شکل وصورت کے اعتبار سے بھی۔ پھر کسی کو ہماری زیادہ پروا بھی نہیں ہوتی تھی۔ امی سے تو پھر بھی کوئی بات کر لیتا مگر مجھ کو تو سب نظر انداز کرتے تب مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ ایسا کیوں ہے؟ بس میں یہ سنتی رہتی تھی کہ امی، نانی یا ماموں، ممانی کے سامنے میرے باپ کی شکایتیں کرتی رہتی تھیں اور پھر کئی بار وہ رونا شروع ہو جاتیں تب مجھے بہت ڈر لگتا تھا کہ کہیں وہ سب مل کر مجھے نہ ماریں کیونکہ میرے ابو امی کو تنگ کرتے تھے۔
میرا دل چاہتا، میں امی سے کہوں وہ ابو کی بات نہ کیا کریں، وہ اس طرح نہ روئیں کیونکہ مجھے ڈر لگتا ہے، مجھے شرم آتی ہے، سب بچے کیا سوچتے ہوں گے کہ میرے ابو کیسے ہیں مگر مجھے یہ سب کہنا نہیں آتا تھا میں بس سوچتی تھی۔

میں جب بھی وہاں جاتی، امی سے چپک کر بیٹھی رہتی۔ نانی مجھے بسکٹ یا مٹھائی کا ایک ٹکڑا دے دیتیں جو واپسی تک میرے ہاتھ میں ہی دبا رہتا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا میں اسے کیسے کھاؤں یا شاید میں کمرے میں رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھنے میں ہی اتنی مگن ہوتی تھی کہ میرا دھیان کھانے پر جاتا ہی نہیں تھا۔
کبھی کبھی امی کہتیں کہ میں جا کر بچوں کے ساتھ کھیلوں تو میں اور بھی ان کے ساتھ چپک جاتی۔ مجھے ان بچوں سے بہت ڈر لگتا تھا وہ میرے جیسے نہیں تھے اس لیے۔
پھر ایک بار جب ہم نانی کے گھر گئے تھے تو وہاں ایک عورت بیٹھی تھی بالکل امی جیسی تھی، پر اس کے کپڑے بہت خوبصورت تھے اور اس نے بہت سا زیور بھی پہنا ہوا تھا۔ امی نے بتایا کہ وہ عفی خالہ ہیں۔ وہ ملک سے باہر رہتی تھیں۔ اب پاکستان آ گئی تھیں۔ عفی خالہ نے امی سے گلے ملنے کے بعد مجھے گود میں اٹھا لیا تھا اور بہت بار میرا منہ چوما تھا۔ مجھے بہت ڈر لگا تھا۔ پہلی بار کسی نے میرا منہ چوما تھا اور مجھے گود میں اٹھایا تھا۔ حالانکہ مجھ پر کسی کو پیار نہیں آتا تھا۔ وہ مجھے اسی طرح گود میں لیے بیٹھی رہیں پھر ایک بہت پیارا سا بچہ کمرے میں آیا تھا۔ عفی خالہ نے اس سے میرا تعارف کروایا۔
''یہ اسود ہے میرا بیٹا، کلاس ٹو میں پڑھتا ہے اور اسود یہ مہرین ہے تمہاری حبیبہ خالہ کی بیٹی۔''
اسود نے مسکراتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں؟ مگر عفی خالہ نے میرا

ہاتھ پکڑ کر آگے کر دیا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں گھبرا گئی تھی۔ اس کا ہاتھ اتنا سفید اور نرم تھا اور میرا اتنا سانولا اور پتلا سا۔" عفی خالہ نے مجھے نیچے اتارتے ہوئے کہا۔

"اسود اسے ساتھ لے جاؤ اور جا کر کھیلو۔"

اسود نے بلا تامل میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے باہر لان میں لے گیا۔ میں کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ باہر آ گئی۔ بڑے ماموں کی بیٹی عالیہ نے مجھے دیکھ کر کہا تھا۔

"اب تم مہرین کو کھیلنے کے لیے لے آئے ہو مگر ٹیم تو پوری ہے۔" میں اس کی بات پر بے حد شرمندہ ہوئی تھی۔

"کوئی بات نہیں ہم کچھ اور کھیل لیتے ہیں۔" اسود نے بڑے اطمینان سے کہا تھا۔

"نہیں ہم تو یہی کھیلیں گے اتنا مزا آ رہا ہے اور مہرین تو پہلے بھی کبھی نہیں کھیلتی۔"

عالیہ نے کہا تھا میں نے اسود کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"مجھے کھیلنا نہیں آتا۔ مجھے نہیں کھیلنا۔"

"تم کھیلو گی تو کھیلنا آئے گا، ایسے کیسے آئے گا؟" اس نے مجھے کہا تھا مگر میں بھاگتی ہوئی اندر امی کے پاس چلی گئی تھی۔

یہ اسود سے میری پہلی ملاقات تھی۔ امی کے ساتھ گھر جانے کے بعد بھی مجھے وہ بہت دیر تک یاد آتا رہا۔ عفی خالہ نے مجھے ڈھیروں کھلونے اور کچھ چاکلیٹس اور سویٹس دی تھیں۔ گھر جا کر میں سارا دن ان کھلونوں سے کھیلتی رہی۔ میرے پاس چابی سے چلنے والا کوئی کھلونا نہیں تھا اور جو کھلونے تھے وہ بھی بہت سستے تھے۔ بہت دنوں تک میں گھر میں ہر آنے جانے والے کے سامنے وہ کھلونے لیئے پھری عفی خالہ مجھے بہت اچھی لگنے لگی تھیں۔

پھر ان ہی دنوں ابو کی ڈ۔تھ ہو گئی تھی تب میں شاید سات سال کی تھی۔ جب ایک دن دوپہر کے وقت کچھ لوگ ابو کو ایک چارپائی پر ڈال کر لائے تھے۔ ان کے سارے کپڑے کیچڑ سے بھرے ہوئے تھے اور ان کے بال بھی کیچڑ سے اٹے تھے۔ وہ نشہ کر کے کسی نالی میں گر گئے تھے اور پھر زیادہ مدہوش ہونے کی وجہ سے وہ وہیں مر گئے تھے۔ گھر میں ایک دم کہرام مچ گیا تھا، میری دادی، پھوپھو، چچا اور امی سب دھاڑیں مار کر رو رہے تھے مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے، مرنا کیا ہوتا ہے، مرنے اور سونے میں کیا فرق ہوتا ہے؟

ابو سے بہت اجنبیت تھی وہ عام طور پر نشے میں ہوتے تھے، جب مدہوش ہوتے تھے تو گھر کے کسی کونے میں پڑے ہوتے تھے اور جب پرسکون حالت میں ہوتے تھے تو یا امی سے جھگڑتے رہتے یا گھر کے کسی اور فرد سے، انھیں میرا خیال ہی نہیں آتا تھا۔

ان کا پیار بس یہ ہوتا تھا کہ کبھی کھانا کھاتے ہوئے یا کچھ اور کھاتے ہوئے وہ مجھے کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے اور میں اس پر ہی بہت خوش ہو جاتی تھی پر جب وہ لڑتے یا نشہ کر کے لیٹے ہوتے تو مجھے ان سے بہت ڈر لگتا تھا۔

ان کی موت پر بس مجھے یہ پتا تھا کہ وہ نالی میں گر کر مرے ہیں اور نالی گندی جگہ ہوتی ہے پھر وہ کیچڑ سے

لتھڑے ہوئے تھے اور کیچڑ کوئی اچھی چیز تو نہیں ہوتا اور سب لوگ بھی بار بار یہ کہتے تھے کہ خدا ایسی موت سے بچائے۔

میں اندر ایک کمرے میں جا کر بیڈ کے نیچے چھپ گئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ ننھیال سے سب آئیں گے تو وہ ابو کو دیکھ کر کیا کہیں گے کہ وہ کتنے گندے ہیں، میری کزنز میرا مذاق اڑائیں گی، میں ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی پھر پتا نہیں کتنی دیر میں بیڈ کے نیچے رہی۔ میں وہاں سو گئی تھی۔ جب میں جاگی اور باہر نکلی تو شام ہو رہی تھی، ابو کو دفنایا جا چکا تھا۔ میں باہر آئی تو وہاں زیادہ لوگ نہیں تھے اور ابو بھی نہیں تھے۔ میرے ننھیال والے امی کے پاس بیٹھے تھے۔ میں خوش تھی کہ ابو وہاں نہیں ہیں اور انھوں نے ابو کو اس حالت میں نہیں دیکھا مگر پتا نہیں انھیں پھر بھی ان کے نالی میں گرنے کا کیسے پتا چل گیا تھا۔

ایک ماہ بعد امی مجھے لے کر ننھیال آ گئی تھیں ہمیشہ کے لیے۔ میں پہلے سے بھی زیادہ ڈرنے لگی تھی ان سب سے، کئی دنوں تک سب ابو کا ذکر کرتے رہے ان کے جھگڑوں کا، ان کی بری عادات کا، ان کی موت کا اور نالی کا، نانی میری امی سے کہا کرتی تھیں:

''شکر کرو اللہ نے جان چھڑا دی ایسے شوہر کا نہ ہونا ہونے سے بہتر ہے۔ تمھیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

میرا دل چاہتا تھا میں بھی نظر اٹھا کر کسی کو نہ دیکھوں، مجھے سب سے بہت شرم محسوس ہوتی تھی۔

ننھیال آنے کے بعد امی نے میرا اسکول بدل دیا تھا، اب میں بھی اپنی کزنز کے ساتھ بہت بڑے اسکول میں جاتی تھیں میرا پہلا چار کمرے کا اسکول اس اسکول کے ایک بلاک کے برابر بھی نہیں تھا۔ سب کچھ بہت ڈراؤنا لگتا تھا مجھے، یہاں کوئی بھی میرا دوست نہیں تھا۔

پھر کچھ ماہ کے بعد ایک دن امی مجھے لے کر عظمیٰ خالہ کے گھر گئی تھیں۔ اسود کا گھر تو نانی کے گھر سے بھی بڑا تھا۔ عظمیٰ خالہ نے مجھے دیکھ کر پیار اٹھا لیا تھا، وہ مجھے اندر لے گئی تھیں۔ پھر انھوں نے اسود کو آواز دی تھی۔ میں ڈرائنگ روم میں آ کر اور بھی حیران ہوئی تھی، وہاں ایسی ایسی چیزیں تھیں جو میں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ عظمیٰ خالہ نے مجھے صوفے پر بٹھا دیا تب ہی اسود اندر آیا تھا۔

''دیکھو اسود مہرین آئی ہے تم اسے اپنے کمرے میں لے جاؤ کھیلو اس کے ساتھ اور فریج سے چاکلیٹ نکال کر دو اسے۔''

انھوں نے اسود سے کہا تھا۔ میں جانا نہیں چاہتی تھی مگر اسود مجھے زبردستی لے گیا تھا۔ اس کا کمرہ دیکھ کر میں دنگ رہ گئی تھی۔ وہاں اتنے کھلونے تھے کہ وہ کمرہ ایک......ٹوائے شاپ لگتا تھا۔ اس کے کمرے میں ٹی وی اور وی سی آر بھی تھا۔ وہ اس وقت ایک ویڈیو گیم کھیل رہا تھا۔ وہ مجھے بھی ٹی وی کے پاس لے گیا۔ میں ٹی وی اسکرین پر بھاگتے دوڑتے turtles کو دیکھ کر بہت حیران تھی۔

''تمھیں گیم کھیلنی آتی ہے؟'' اس نے کنٹرولر ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا تھا۔

''نہیں .....'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ دیر خاموشی سے گیم کھیلتا رہا میں کنٹرولر پر حرکت کرتی اس کی انگلیوں کو دیکھتی رہی۔ پھر اچانک اس نے کنٹرولر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

''تم کھیلو ذرا یہ اتنا بھی مشکل نہیں ہے۔'' میں گھبرا گئی تھی۔

''نہیں مجھے کھیلنا نہیں آتا'' میں خوفزدہ تھی کہ کسی بٹن کو پریس کرنے سے کہیں گیم خراب نہ ہو جائے۔

''بہت آسان ہے یہ، ایسے کھیلتے ہیں۔'' اس نے کنٹرول پر ہاتھ چلا کر مجھے دکھایا تھا۔

''لو اب تم کرو۔'' میں نے جھجکتے ہوئے بٹن دبایا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر گیم کھیلنا شروع کر دیا بالکل ویسے جیسے کوئی بچے کا ہاتھ پکڑ کر اسے لکھنا سکھاتا ہے۔ کچھ دیر تک میں ڈری رہی مگر وہ بڑی مہارت سے میرا ہاتھ پکڑ کر بٹنوں کو آگے پیچھے کرتا رہا۔ اسکرین پر نمبر بڑھ رہے تھے۔ میں مسکرانے لگی تھی۔ شاید بہت عرصے کے بعد میں تب مسکرائی تھی۔

وہ گیم کھیلتے ہوئے چیخیں مارتا، اسکور کرنے پر منہ سے آوازیں نکالتا، نعرے لگاتا، چانس لوز کرنے پر خود کو ڈانٹتا، مجھے گیم سکھا رہا تھا۔ ایک گیم کھیلنے کے بعد اس نے مجھے کنٹرولر دے دیا تھا۔

''اب تم خود کھیلو۔'' اس نے مجھے کہا تھا۔ میں نے انکار کیے بغیر کنٹرولر تھام لیا۔ اس نے گیم اسٹارٹ کر دی پھر مجھے ہدایات دینے لگا میں اس کی ہدایات کے مطابق لرزتے ہاتھوں سے بٹن دباتی رہی۔ وہ میرے اور اپنے لیے ایک ٹرے میں کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے کر آیا۔ پہلی دفعہ مجھے کسی کے گھر کچھ کھاتے ہوئے جھجک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں اس سے باتیں کرتی رہی، بے کار، بے معنی باتیں مگر وہ اس طرح سنتا رہا جیسے وہ بہت کام کی گفتگو تھی۔ پھر وہ مجھے اپنے کھلونے دکھاتا رہا۔ اس رات وہاں سے واپسی پر میں بہت خوش تھی۔ میں نے امی سے کہا تھا۔

''امی پھر کب جائیں گے؟''

اور پھر میں ان کے گھر جانے کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ ہم دونوں کھیلتے تھے، باتیں کرتے تھے۔ وہ میرے کہے بغیر کوئی بھی کھلونا اٹھا کر مجھے دے دیتا یا کہتا اچھا تم یہ کھیلنے کے لیے لے جاؤ۔ جب میں آؤں گا تو واپس لے جاؤں گا مگر وہ جب بھی آتا تو کبھی بھی اپنا کھلونا واپس لے کر نہیں جاتا بلکہ کہتا کہ میں نے اور لے لیا ہے اب وہ تم لے لو۔

رفتہ رفتہ میری الماری کھلونوں سے بھر گئی تھی۔ وہ جب بھی ننھیال آتا تو سب سے زیادہ میرے ساتھ کھیلتا اور اگر کبھی کوئی مجھے اپنے ساتھ کھلانے سے انکار کرتا تو وہ خود بھی کھیلنے سے انکار کر دیتا۔ میں اسے اپنی کاپیوں پر ٹیچرز کے دیے ہوئے اسٹارز دکھاتی تو وہ خود بھی اپنی جیب میں رکھے ہوئے پین سے ان پر اسٹار بناتا یا ٹیچرز کے ریمارکس کے نیچے وہی ریمارکس لکھ دیتا۔

میں ہمیشہ اپنی چیزیں اسے دکھانے کے لیے اس کا انتظار کرتی رہتی۔ اپنے بیگ میں کچھ نہ کچھ سویٹس جمع کرتی رہتی کہ جب وہ آئے گا تو مل کر کھائیں گے۔ پھر ہم دونوں مل کر وہ سویٹس اور دوسری چیزیں کھاتے مجھے بہت فخر کا احساس ہوتا تھا کہ میں نے بھی اسے کچھ کھلایا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم دونوں کی دوستی بہت مضبوط ہوتی گئی تھی۔ وہ بہت صاف گو، بہت سچا تھا۔اسے جھوٹ اور منافقت سے نفرت تھی۔ مجھے باقی چیزوں کے ساتھ یہ بات بھی پسند تھی۔ میں اپنے جذبات اور احساسات کے بارے میں اس سے کبھی بات نہیں کرتی تھی۔ میں کبھی اسے اپنے کمپلیکسز کے بارے میں نہیں بتاتی تھی۔ کیونکہ میں شرمندہ ہونا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے لگتا تھا وہ مجھے بہت بہادر بہت مضبوط دیکھنا چاہتا ہے میں یہی ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ میں ایسی ہی ہوں۔

اب ہماری ملاقاتیں پہلے کی طرح زیادہ تو نہیں ہوتی تھیں مگر پھر بھی ہفتے میں ہم ایک بار تو مل ہی لیتے تھے۔ کبھی وہ یہاں آجاتا تھا کبھی میں ان کے گھر چلی جاتی تھی اور کبھی وہ فون کرلیا کرتا تھا۔اب ہم کھلونوں سے نہیں کھیلتے تھے۔اب ہم دوسری چیزوں کے بارے میں باتیں کرتے تھے، وہ اپنے پلان بتاتا رہتا تھا۔ مجھے اس سال یہ کرنا ہے، اس سال یہ اور اس سال یہ۔ اس کے پاس اپنے اگلے بیس سالوں کی پلاننگ موجود تھی۔ وہ اتنا ذہین تھا کہ مجھے اس پر رشک آتا تھا۔ ہر بات کا اسے پتا ہوتا تھا، ہر مسئلہ کا حل اس کے پاس ہوتا تھا۔میرا دل چاہتا تھا میں ہر وقت اس کی باتیں سنتی رہوں۔اس نے کبھی مجھے میری کم مائیگی کا احساس نہیں دلایا، کبھی یہ نہیں جتایا کہ میری شکل وصورت کتنی عام ہے یا یہ کہ مجھ میں کوئی بھی خاص بات نہیں ہے۔

وہ معمولی بات پر بھی میری تعریف کرتا تھا۔ایسے کام کی بھی جس پر شاید کوئی بات کرنا بھی گوارا نہ کرتا۔میرا دل چاہتا تھا میں اسے بتاؤں کہ میں اسکول میں کن کن چیزوں میں حصہ لیتی رہتی ہوں، کون کون سے کام میں کرتی رہتی تھی مگر میں اسے کبھی بھی یہ بتانے کی ہمت نہیں کر پائی۔ وہ غیر نصابی سرگرمیوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا تھا اور مجھے لگتا تھا کہ شاید ان چیزوں میں میری achievements کو وہ زیادہ اہمیت نہیں دے گا سو میں نے کبھی اسے نہیں بتایا کہ میں شاعری کرتی ہوں یا تقریریں کرتی ہوں یا کمپیئرنگ کرتی ہوں، مجھے لگتا تھا وہ ہنس پڑے گا کبھی یقین نہیں کرے گا کہ میں بولنے والا کوئی کام بھی کرسکتی ہوں۔ کیونکہ وہ کہتا تھا:

''تم بہت کم بولتی ہو حالانکہ زیادہ بولنا چاہیے کم از کم اتنا تو بولنا چاہیے کہ مقابل آپ کو جاہل نہ سمجھے۔''

مگر پھر بھی ہم دونوں میں بہت اچھی دوستی تھی میرے علاوہ خاندان میں کسی کے ساتھ اس کی اتنی نہیں بنتی تھی، وہ جھگڑالو نہیں تھا مگر وہ بڑا ہو کر کافی ریزرو ہو گیا تھا۔ مجھے بہت اچھا لگتا تھا کہ کوئی تو ہے جو خاندان میں صرف مجھے اہمیت دیتا ہے کسی اور کو نہیں حتیٰ کہ شعل کو بھی نہیں۔

وہ ہر سال میری برتھ ڈے پر مجھے کارڈ اور تحفہ ضرور بھیجتا تھا اور یہ واحد کارڈ اور گفٹ ہوتا تھا جو مجھے ملتا تھا، میں نے کبھی بھی ان تحفے میں ملے ہوئے پرفیومز یا دوسری چیزوں کو استعمال نہیں کیا، مجھے ڈر لگتا تھا کہ کہیں وہ ختم نہ ہو جائیں اور میں انھیں ہمیشہ پاس رکھنا چاہتی تھی اور اب وہ باہر چلا گیا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ سب سے ملنے آیا تھا۔ مجھ سے بھی ملا تھا۔ میرا دل چاہا تھا میں رونے لگوں، پتا نہیں اب میں اسے کب دیکھوں گی، پتا نہیں اب یہ دوستی رہے گی بھی یا نہیں۔

اس نے مجھے کہا تھا کہ میں اسے خط لکھا کروں اور وہ بھی مجھے خط لکھے گا۔ لیکن خط لکھنے سے کیا ہوگا۔ میں

اسے دیکھ تو نہیں سکوں گی نا اور نہ ہی اس سے بات کر سکوں گی۔ مجھے اپنا آپ بہت تنہا لگ رہا ہے۔ مجھے بہت رونا آ رہا ہے۔

............❁............

20-03-1983

آج اسکول میں میرا آخری دن تھا۔ اب میں پہلے کی طرح دوبارہ کبھی وہاں نہیں جا پاؤں گی۔ میں 8th کے بعد اس اسکول میں آئی تھی وہ بھی صرف اس لیے کیونکہ میں مشعل وغیرہ کی گاڑی میں ان کے ساتھ اسکول جانا نہیں چاہتی تھی پھر مشعل بھی میری کلاس میں تھی۔ میں ہمیشہ اس خوف میں رہتی تھی کہ وہ میرے بارے میں کسی کو کچھ بتا نہ دے۔ میں کچھ بھی نہیں کر پاتی تھی ٹیچرز بھی مجھ پہ اتنی توجہ نہیں دیتے تھے۔ جتنی وہ مشعل پر دیتے تھے کیونکہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اتنی خوبصورت کہ مجھے لگتا اللہ نے دُنیا میں اور کسی کو اتنا خوبصورت نہیں بنایا، پھر اس کے پاس جو چیز بھی ہوتی تھی وہ کلاس میں کسی کے پاس بھی نہیں ہوتی تھی۔

ماموں اور ممانی اس کے لیے بہت خوبصورت چیزیں لایا کرتے تھے۔ وہ پوری کلاس کو اپنی چیزیں دکھاتی رہتی تھی اور میں ڈرتی رہتی تھی کہ کہیں کوئی کلاس فیلو مجھ سے پوچھ نہ لے کہ وہ میری کزن ہے پھر میرے پاس ویسی چیزیں کیوں نہیں؟ پھر اگر مجھے چھٹی کے وقت گیٹ پر آنے میں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو سب مجھے بری طرح جھڑکتے تھے، ڈرائیور بھی۔ گھر آ کر ڈانٹ الگ پڑتی تھی کبھی نانی سے کبھی ممانی سے۔

مشعل کی بات پر سب ایک لمحے کا انتظار کیے بغیر یقین کر لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ بہت جھوٹ بولتی ہے مگر وہ اتنی خوبصورت، اتنی معصوم ہے کہ ہر شخص فوراً اس پر یقین کر لیتا ہے اور میں اگر چیخ چیخ کر بھی سچ کہوں تو کسی کو یقین نہیں آتا، میری ٹیچر کو بھی نہیں آیا تھا جب ایک دن کلاس کے دروازے کے پاس رکھا ہوا گملا مشعل سے ٹوٹ گیا تھا۔

ہم لوگ اس روز صبح سب سے پہلے آئے تھے۔ مشعل مجھ سے آگے چل رہی تھی کلاس میں داخل ہوتے ہوئے اچانک اس کے بازو سے بیگ سیدھا گملے پر گرا تھا۔ اور گملا زمین پر گر گیا تھا اس نے فوراً بیٹھ کر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی مگر وہ ایک کنارے سے ٹوٹ چکا تھا۔ مشعل نے میری طرف دیکھا میں خاموشی سے اندر چلی گئی وہ بھی اندر آ گئی۔

ٹیچر بیل بجنے پر اندر آئی تھیں اور انھوں نے آتے ہی گملے کے بارے میں پوچھا تھا۔ کلاس میں خاموشی رہی تھی۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ گملا کس نے توڑا ہے۔ سوائے میرے اور مشعل کے، ٹیچر نے دوبارہ کہا تھا۔

"میں آپ سے پوچھ رہی ہوں کہ یہ گملا کس نے توڑا ہے؟" یک دم میں نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا۔

"ٹیچر یہ مشعل کا بیگ گرنے کی وجہ سے ٹوٹا ہے۔"

مشعل نے میرے جملے پر مڑ کر مجھے دیکھا تھا۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو، یہ گملا میں نے نہیں توڑا، اگر مجھ سے ٹوٹتا میں بتا دیتی۔"

اس نے مجھے کہا تھا۔ مگر اس وقت مجھے شدید صدمہ ہوا تھا جب ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر ٹیچر نے کہا تھا۔

”مہرین آپ کو شرم آنی چاہیے۔ آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ وہ بھی اپنی کزن کے بارے میں، آپ کی سزا یہ ہے کہ آپ میرے پیریڈ میں کھڑی رہیں۔“

میں ایک لفظ بھی اپنی صفائی میں نہیں کہہ سکی تھی۔ وہ چالیس منٹ میرے لیے بہت انسلٹنگ تھے۔ میں اگلے کئی دن اپنی کلاس فیلوز اور مشعل سے نظریں چراتی پھری۔

مشعل نے گھر آ کر ممانی کو بھی یہ بات بتائی تھی اور ممانی کے ساتھ ساتھ ماموں نے بھی مجھے جھڑکا تھا اور رہی سہی کسر نانی نے پوری کر دی تھی۔

میرا دل اس اسکول سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ میں وہاں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہاں میری شناخت مشعل کی کزن کی حیثیت سے ہوتی تھی، خوبصورت مشعل کی عام صورت کی کزن اور 8th کلاس کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے نانی سے کہا تھا کہ مجھے اس اسکول میں نہیں پڑھنا۔ مجھے چاہے کسی گورنمنٹ اسکول میں داخل کروا دیں مگر میرا اسکول بدل دیں میری خواہش بہت آرام سے پوری کر دی گئی۔ مشعل کی امی پہلے ہی چاہتی تھیں کہ مجھے لانے اور لے جانے کی ذمہ داری سے ان کی جان چھوٹ جائے، سو انھوں نے اس خواہش کی تکمیل میں اہم رول ادا کیا تھا۔

امی نے پتا چلنے پر مجھے ڈانٹا تھا مگر مجھے ان کی پروا نہیں تھی۔ وہ میرا مسئلہ نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ مجھے لانے لے جانے کے لیے ایک وین لگا دی گئی تھی اور ایک گورنمنٹ اسکول میں میرا داخلہ کروا دیا گیا لیکن میں بے حد خوش تھی یوں لگتا تھا جیسے میں ایک قید خانے سے چھوٹ کر آئی تھی۔ یہاں میری جیسی لڑکیاں تھیں، ان کے گھروں میں بھی ویسے ہی مسائل تھے جیسے میرے گھر میں تھے، یہاں مجھے خوبصورت لڑکیوں سے ڈر نہیں لگتا تھا، یہاں کوئی مشعل نہیں تھی۔ میں اسٹڈیز میں اچھی تھی اور بہت جلد میں نے اپنی اہمیت منوالی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ میں نے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اپنا پہلا ہی تقریری مقابلہ میں نے جیت لیا تھا پھر میں نے ہر چیز میں حصہ لینا شروع کر دیا اور جس چیز میں حصہ لیتی تھی اس میں باقی لڑکیاں حصہ لینے سے گھبراتی تھیں اگر وہ مقابلہ کرتیں بھی تو دوسری یا تیسری پوزیشن کے لیے۔

میں اسکول میں لائم لائٹ میں رہتی تھی۔ وہ اہمیت ملی تھی یہاں مجھے جو پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔ لڑکیاں مجھ سے دوستی کرنے کے لیے بے تاب رہتی تھیں۔ بعض کلاسز کی لڑکیاں مجھے عشقیہ خط لکھا کرتی تھیں۔ بعض مجھے تحفے بھیجا کرتی تھیں۔ ٹیچرز کے لیے میری بات حرفِ آخر ہوتی تھی آدھا اسکول مجھ سے خائف تھا اور باقی آدھا میرا فین۔ یہی وجہ تھی کہ آج ہیڈ مسٹریس نے الوداعی تقریب میں خاص طور پر میرے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا۔ بے تحاشا لڑکیاں مجھ سے ملتے ہوئے رو رہی تھیں ان میں چھوٹی کلاسز کی لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔

میں آج کچھ اداس تو ہوں مگر مجھے پتا ہے اب مجھے آگے کیا کرنا ہے۔ مجھے آگے کالج کی دنیا فتح کرنی ہے۔ میں چاہتی ہوں جب میں کالج چھوڑوں تو وہاں کے لوگ بھی ایسے ہی مجھے یاد کریں۔ انھیں یاد رہے کہ ہاں کسی زمانے میں یہاں ایک مہرین منصور ہوتی تھی اور مجھے اب اسی کالج میں جانا ہے جہاں مشعل جائے گی۔ پہلے میں اس کا سامنا کرنے سے گھبراتی تھی مگر اب مجھے اس کا سامنا کرنا ہے۔ مجھے اسے بتانا ہے کہ میں مہرین منصور
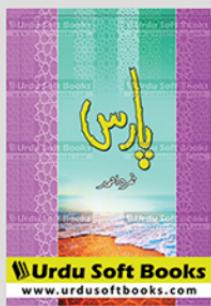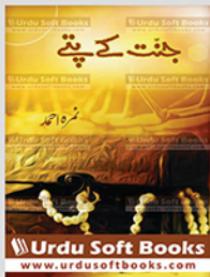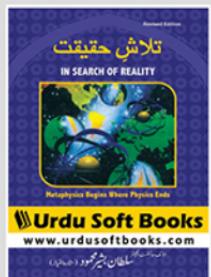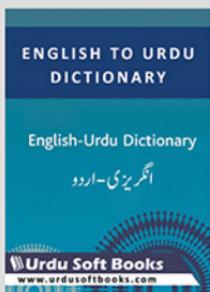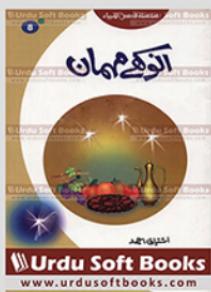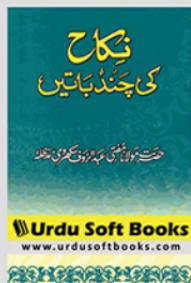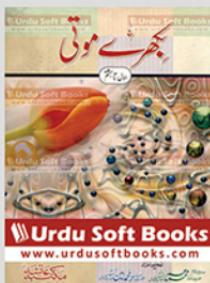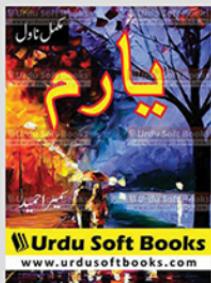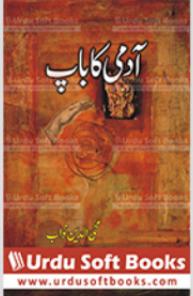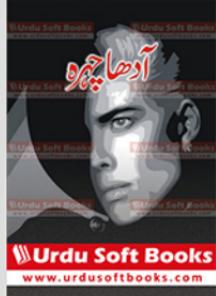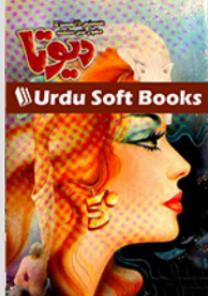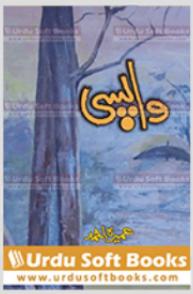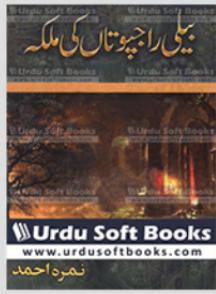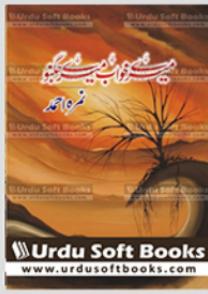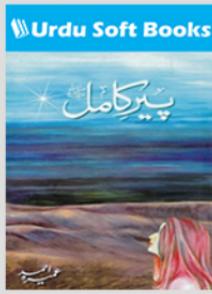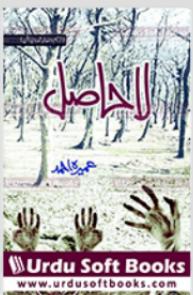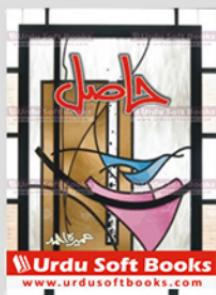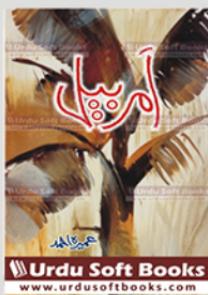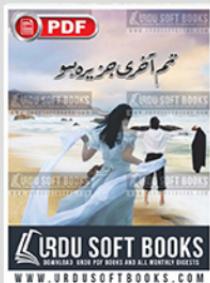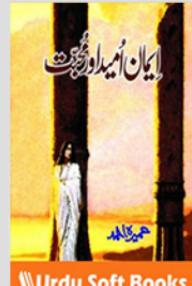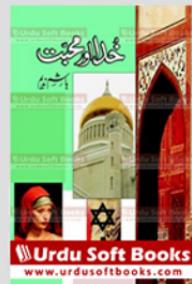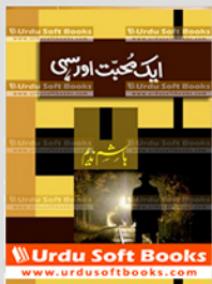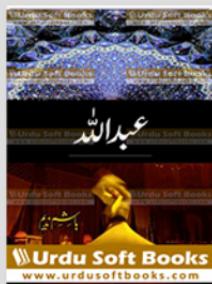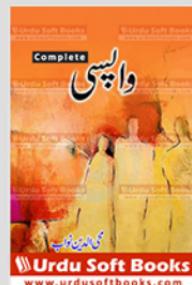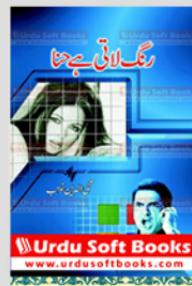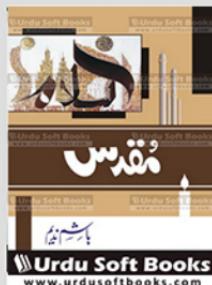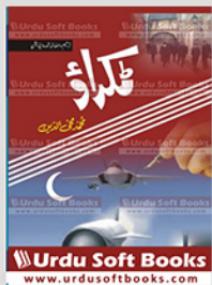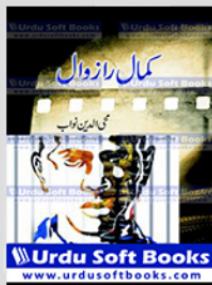
اس جیسی شکل وصورت نہ رکھنے کے باوجود کچھ ہوں، اس سے بہتر نہ سہی اس سے بدتر بھی نہیں ہوں۔

............❁............

12-12-1984

آج ایک طویل عرصے کے بعد اسود سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن یہ ملاقات ویسی نہیں تھی جیسی پہلے ہوتی تھی۔ وہ بہت بدل چکا تھا بلکہ مکمل بدل چکا ہے اس کی آنکھوں میں میرے لیے وہ نرمی وہ انس نہیں رہا جس سے میں آشنا تھی۔ شاید اس لیے کہ اب میرے بارے میں اس کی رائے بدل چکی ہے اور شاید ترجیحات بھی۔

میری جگہ اب مشعل نے لے لی ہے۔ ہمیشہ کی طرح یہاں بھی اس نے مجھے replace کر دیا ہے۔ کافی مشکل ہوتا ہے کسی ایسے بندے کے سامنے بیٹھ کر بات کرنا جس کے بارے میں آپ یہ جانتے ہوں کہ وہ آپ کے بارے میں اچھے خیالات نہیں رکھتا جو شاید آپ سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتا مگر اخلاقیات کے ہاتھوں مجبور ہے مگر مجھے اسود علی سے پھر بھی نفرت نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ بندہ ہے جس نے مجھے میرے خوف کے کنوئیں سے نکالا تھا۔

میں مہرین منصور جو کسی کے ایک بار بے اعتنائی دکھانے پر دوبارہ اس کی طرف دیکھنا پسند نہیں کرتی، میں اب بھی اس کی عزت کرتی ہوں، آج میں عفی خالہ کی طرف گئی تھی اور وہاں وہ تھا، خالہ گھر پر نہیں تھیں۔ میں واپس جانے کی بجائے لاؤنج میں بیٹھ گئی تھی۔ تبھی وہ مشعل کے ساتھ اندر آیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا تھا۔

''کیسی ہو مہرین؟'' اس نے بہت سرسری انداز میں پوچھا تھا۔

''ٹھیک ہوں، میں خالہ سے ملنے آئی تھی۔''

''وہ مارکیٹ گئی ہیں بس آنے والی ہیں تم انتظار کر لو۔ آؤ مشعل۔'' اس نے میری بات کا جواب دے کر مشعل کو مخاطب کیا تھا۔

''ہاں چلو ارے مہرین آؤ نا تم بھی یہاں تنہا بیٹھ کر کیا کرو گی آ جاؤ تم بھی۔'' مشعل نے مجھے کہا تھا، اسود کے سامنے وہ مجھے اس طرح مخاطب کرتی تھی جیسے میں اس کی بہترین دوست ہوں اور ویسے کئی کئی ماہ ہم دونوں آپس میں بات نہیں کرتے تھے اگر بات کرتے بھی تو وہ کوئی اتنی خوشگوار نہیں ہوتی تھی۔

''نو تھینک یو۔'' میں نے انکار کر دیا۔ وہ دونوں اندر کی طرف چلے گئے میں ان کی پشت کو دیکھتی رہی۔ چند سال پہلے تک وہ صرف مجھے اس طرح اپنے کمرے میں لے جایا کرتا تھا اور اب میں کہیں بھی نہیں تھی۔ زندگی کوئی تقریری مقابلہ نہیں ہے جس کو میں اپنے الفاظ اور بیان سے جیت لوں اور کسی ہتھیار کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ میں وہاں سے آ گئی تھی خالہ سے ملے بغیر، جانتی تھی اب چند دن مشعل بات بے بات میرے سامنے قہقہے لگاتی پھرے گی اور سب سمجھیں گے کہ وہ آج کل اچھے موڈ میں ہے مگر اس کا یہ اچھا موڈ کس چیز کا مرہونِ منت ہوگا یہ صرف میں جانتی ہوں۔ مجھ سے کچھ چھیننا بہت اچھا لگتا ہے اسے، چاہے وہ کسی کی توجہ ہی کیوں نہ ہو اور سب لوگ سمجھتے ہیں وہ بہت مہربان، بہت فیاض بہت ایثار پسند ہے۔ شاید باقی سب کے لیے وہ ایسی ہی ہے مگر اس کی ساری کمینگی میرے لیے ہے، صرف میرے لیے اور نانی کہتی ہیں:

''تم سو بار بھی پیدا ہو جاؤ تو مشعل کی طرح نہیں ہو سکتیں۔''
ہاں میں اس کی طرح نہیں ہو سکتی نہ آج نہ آئندہ بھی۔

............❀............

10-11-19

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ لوگوں کو مجھ میں کیا نظر آتا ہے جس سے وہ متاثر ہو جاتے ہیں؟ کیوں لوگ مجھ سے ایک بار ملنے کے بعد بار بار ملنا چاہتے ہیں۔ میں جب بھی اندازہ لگانے کی کوشش کرتی ہوں میں ناکام ہو جاتی ہوں۔

کتنے مزے کی بات ہے مجھے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے بناؤ سنگھار کا سہارا لینا پڑتا ہے نہ اداؤں کے تیر چلانے پڑتے ہیں۔ میں صرف بولتی ہوں اور وہ کروا لیتی ہوں جو میں چاہتی ہوں۔

آج منسٹر فار انفارمیشن انوائیٹڈ تھے۔ کالج میں ''گورنمنٹ کے انڈر کنٹرول میڈیا یوتھ کے لیے کیا کام کر رہا ہے؟'' یہ مذاکرے کا موضوع تھا اور منسٹر صاحب کی زبردست کھنچائی ہوئی تھی۔ آدمی ذہین اور پڑھے لکھے ہیں مگر اپنے ڈپارٹمنٹ کی نااہلی کو کسی طور بھی وہ خوبصورت الفاظ کے الٹ پھیر میں نہیں چھپا سکے تھے۔

مذاکرے کے اختتام پر گروپ فوٹو کے لیے سب مہمان اور شرکا اکٹھے ہوئے تھے۔ میں نے تصاویر لیے جانے کے بعد منسٹر صاحب سے آٹوگراف کے لیے درخواست کی تھی مگر انھوں نے ہنستے ہوئے اپنا والٹ نکالا اور اس میں سے ایک چھوٹی سی ڈائری کھول کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آٹوگراف تو آپ سے لینے چاہئیں۔''

میں نے بلا تامل ڈائری تھام لی۔ اپنے سائن کرنے کے بعد میں نے لکھا تھا۔

To Mr. Minister who belongs to a class with a weak memory.

پھر میں نے ڈائری ان کی طرف بڑھا دی۔ وہ میری تحریر پڑھ کر بہت خوبصورت انداز میں ہنسے تھے۔

پھر انھوں نے میری آٹوگراف بک لی تھی اور مسکراتے ہوئے کچھ تحریر کر کے میری طرف بڑھایا تھا۔ میں نے آٹوگراف بک لے لی تو انھوں نے اپنا ایک وزیٹنگ کارڈ میری طرف بڑھا دیا۔

''جب بھی آپ کو میری مدد کی ضرورت ہو بلا تکلف آ جائیے گا۔'' انھوں نے کارڈ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے کارڈ لیے بغیر بڑے اطمینان سے ان سے کہا:

''سر کیا آپ کو لگتا ہے کہ مجھے کبھی آپ کی مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے؟''

''نہیں، لیکن ہو سکتا ہے کبھی مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پڑ جائے۔''

انھوں نے برجستہ کہا تھا میں مسکرائی۔

''تو سر پھر آپ کو میرا وزیٹنگ کارڈ مانگنا چاہیے مگر چونکہ میں ابھی بڑے لوگوں کی فہرست میں نہیں آئی اس لیے میرا کوئی وزیٹنگ کارڈ نہیں ہے۔ بہرحال شکریہ مجھے وزیٹنگ کارڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر مجھے کبھی آپ کی مدد

کی ضرورت ہوئی تو میں فون کرلوں گی کیا آپ میرا کام ایک فون پر نہیں کر دیں گے؟"
وہ اس پر ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنسے۔ پھر میری آٹو گراف بک لے کر انھوں نے اس پر اپنا فون نمبر تحریر کر دیا۔
"آپ یقین رکھیں آپ کا کام ایک فون کال پر ہی ہو جائے گا" میں نے ان کا شکریہ ادا کیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد مجھے مختلف لڑکیوں نے گھیر لیا تھا۔ وقتاً فوقتاً ٹیچرز بھی مجھے مبارک باد دینے آ رہی تھیں۔
میرے لیے یہ ہنگامہ نیا نہیں تھا۔ ہر فنکشن کے بعد ایسا ہی ہوتا تھا۔ مبارکبادیں، تعریفیں، تالیاں۔ یہ سب چیزیں اب میری زندگی کا ایک حصہ بن چکی تھیں۔ اپنی فرینڈز کے ساتھ جب میں کچھ کھانے پینے کے لیے کیفے ٹیریا کر بیٹھی تھی تو مجھے آٹو گراف بک کا خیال آیا تھا۔ میں نے اسے کھولا۔

"For Mehreen Mansoor who does not require any good wishes to be uccessful, she is destined to succeed."

میرے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ اچھے ریمارکس تھے۔ میں نے آٹو گراف بک اپنی فرینڈز کی طرف بڑھا دی وہ بھی اسے پڑھ کر مسکرائی تھیں۔
"تمھارے لیے کیا نیا ہے اس میں یار! ایسے ریمارکس تو تمھیں ملتے ہی رہتے ہیں۔"
سارہ نے آٹو گراف بک بند کر کے میری طرف بڑھائی تھی۔ میں کوک کے سپ لیتی رہی۔ مجھے مشعل نظر آئی تھی کیفے ٹیریا میں۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا، پتا نہیں کیوں میں اس پر نظریں جمائے رہی۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک خالی ٹیبل پر اپنی دوستوں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں اسے دیکھتی رہی، اس نے بھی بیٹھنے کے بعد ایک بار پھر میری طرف دیکھا تھا مگر مجھے پہلے سے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے نظر ہٹالی۔
"کھاؤ یار یہ سینڈوچ ختم کرو کہاں گم ہو؟" رخشی نے پلیٹ میرے آگے سرکائی تھی۔ میں نے سینڈوچ اٹھا کر کھاتے ہوئے دوبارہ مشعل کو دیکھنا شروع کر دیا۔ مجھے لگا جیسے وہ نروس ہو گئی تھی شاید میرے اس طرح دیکھنے سے۔
ایسا ہی ہوتا تھا کالج میں جب بھی کہیں وہ ملتی میں اسے دیکھنا شروع کر دیتی تھی اور وہ نروس ہو جاتی تھی۔ مجھے صرف پانچ گھنٹے کی زندگی ملتی تھی ہر روز پانچ گھنٹے کے لیے میں زندہ ہوتی تھی۔ جب میں کالج میں ہوتی تھی، کیونکہ یہاں پر مہرین منصور کو بہت لوگ جانتے تھے اور جو نہیں جانتے تھے، وہ جاننا چاہتے تھے، بات کرنا چاہتے تھے اور جب میں گھر پر ہوتی تو میں کچھ بھی نہیں ہوتی تھی۔ دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے والی ایک یتیم لڑکی جو مشعل کے باپ، چچا اور دادی کے گھر پناہ لی ہوئی تھی۔
گھر میں سب مشعل کو جانتے تھے اسی سے بات کرنا چاہتے تھے۔ وہاں مہرین سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا نہ اس سے ملنا پسند کرتا تھا اور اگر کبھی وہ مہرین کے بارے میں بات کرتے تھے تو وہ بھی اس کے ماضی کے حوالے سے۔ اس کے باپ کے سابقے کے ساتھ۔ گندی نالی میں مرنے والے نشئی کی بیٹی جسے کچھ عظیم لوگوں نے ترس کھا کر سہارا دے دیا تھا اس پر کرم کر دیا تھا اور ان عظیم لوگوں میں وہ بھی شامل تھی مشعل اکبر۔

اسے بہت شوق تھا۔ نشے کے عادی لوگوں کے بارے میں بات کرنے کا۔ یہ بتانے کا کہ ایسے لوگ کتنے گھٹیا اور غلیظ ہوتے ہیں۔ ان کے لیے کیا سزائیں ہونی چاہئیں۔ ایسے لوگ انسانیت کے نام پر کتنا بڑا دھبہ ہوتے ہیں۔ مکروہ لوگ جن کا مرنا ان کے جینے سے بہتر ہوتا ہے۔ وہ اکثر گھر میں یہ گفتگو کرتی رہتی تھی خاص طور پر تب جب میں کالج میں کوئی مقابلہ جیتتی تھی۔ تب وہ گھر پر میرا استقبال اسی قسم کی گفتگو سے کرتی تھی۔ وہ یہ ذکر شروع کرتی اور بات چلتے چلتے میرے باپ کے تذکرے اور مثالوں پر آ جاتی تھی۔ وہی نشئی، وہی نالی، وہی کیچڑ۔

کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے میں پوری دنیا کو آگ لگا دوں۔ میرا ماضی، میرا خاندان، میرا باپ یہ سب حوالے کیوں ضروری ہیں میری پہچان کے لیے؟ میں ان کے بغیر بھی کچھ ہوں وہ سب یہ کیوں نہیں مان لیتے؟ مجھے وہ بار بار میرا باپ کیوں یاد دلاتے رہتے ہیں؟ مجھے وہ بھولا ہی کب ہے۔ میرے ذہن سے کیچڑ میں لتھڑی ہوئی وہ لاش کب فراموش ہوئی ہے۔ اگر وہ لاش میرے باپ کی تھی تو اس میں میرا کیا قصور تھا؟ کیا میں نے خود اسے چنا تھا؟ اگر وہ نشہ کرتا تھا تو کیا یہ میری غلطی تھی؟ اگر مشعل کا باپ نشہ نہیں کرتا تھا تو اس میں اس کا کیا کمال تھا؟ وہ میری جگہ پر بھی تو ہو سکتی تھی، پھر وہ کیا کرتی؟ تب اس کی خوبصورتی بھی اس کے کسی کام نہ آتی۔ جیسے میری کوئی خوبی ان کا منہ بند نہیں رکھ سکتی۔ میری ذہانت، قابلیت، صلاحیتیں مل کر ایک بہت بڑا زیرو بن جاتی ہیں۔

چودہ سال پہلے کا وہ واقعہ لوگوں کے ذہن پر ایسے نقش ہے کہ ان کے دل میں میرے لیے جگہ ہی نہیں بنتی۔ میں اسی لیے نانی کے پاس نہیں بیٹھتی۔ ان کے پاس میرے لیے لفظ نہیں خنجر ہوتے ہیں پھر وہ چاہتی ہیں کہ جب وہ یہ خنجر میرے جسم میں اتاریں تو میں آہ تک نہ کروں۔ وہ بھی مجھے اچھی نہیں لگتیں، وہ سب کے لیے اچھی ہیں بس میرے لیے نہیں، انھیں ہر وقت یہ زعم رہتا ہے کہ انھوں نے مجھے پال کر اپنی عاقبت سنوار لی ہے۔

''کون ہے جو اس دور میں کسی بے سہارا کو سہارا دیتا ہے۔ اے بی بی شکر کرو خدا کا اور احسان مانتی رہا کرو میری اس نیک اولاد کا جنھوں نے تمھیں اپنی اولاد کی طرح پالا ورنہ پتا نہیں اپنے باپ کی طرح تم کہاں کہاں رُلتی رہتیں۔''

''کیا احسان کیا ہے آپ نے اور آپ کی اولاد نے مجھ پر؟ میں نے انھیں کہا تھا مجھے یہاں لا کر پالیں؟ آپ اپنی مرضی سے لائے تھے پھر میری ماں کی شادی کر دی اور مجھے یہاں رکھ لیا۔ جانے دیتے مجھے ماں کے ساتھ ،احسانوں کے جتنے تذکرے یہاں سنتی ہوں وہاں بھی سن لیتی۔ مگر آپ کو اپنی دریا دلی اور ایثار دکھانے کے لیے ایک زندہ مثال چاہیے تھی سو آپ مجھے کیسے جانے دیتے؟

یہ جو اتنے سالوں میں آپ نے اتنا نام بنا لیا ہے۔ لوگوں کو یہ بتا کر کہ آپ نے کیسی خدا ترسی دکھائی ہے کہ ایک یتیم بچی کو پالا ہے وہ نام کیسے گنوا دیتے؟ اپنی نیک نامی اور خدا ترسی کی یہ مفت پبلسٹی آپ کیسے اپنے ہی ہاتھوں سے کھو دیتے؟ بہت کمال کیا آپ نے مجھے پال کر، بہت احسان کیا۔ ایسا کارنامہ تو دنیا میں اور کوئی نہیں کرتا۔ نہ پہلے کبھی کسی نے ایسا کچھ کیا نہ آئندہ ایسا کچھ کرے گا۔ آپ کے گھر کے ہر فرد کو تو نوبل پرائز ملنا چاہیے۔

بلکہ اپنی خدا ترسی کی یہ داستان میری تصویر کے ساتھ ایک کتبے پر کندہ کر کے باہر گیٹ پر لگا دیں۔''

آج پھر میں نانی سے الجھ پڑی تھی۔ جو ایک معمولی سی بات پر مجھے پھر سے احسان یاد دلانے بیٹھ گئیں۔

"نہ تمہاری شکل اچھی ہے نہ زبان۔" انھوں نے پھر ایک طعنہ دیا تھا۔ میں ہنس پڑی۔

"ہاں کچھ لوگوں کی شکل اور زبان خوفناک ہوتی ہے اور کچھ کا دل اور دماغ۔" وہ میری بات پر سلگ اٹھی تھیں۔

"مشعل کو دیکھو اور خود کو دیکھو، وہ کیا ہے اور تم کیا ہو؟ کوئی ایک خوبی نہیں تم میں جسے تم گنوا سکو۔" انھوں نے پھر مشعل کی مثال پیش کی تھی۔

"مشعل کی کیا بات ہے وہ بہت عظیم ہے۔ میرا اور اس کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے پھر ایسے موازنے نہ کریں۔ میں پہلے ہی بہت متاثر ہوں اس سے اور کتنا متاثر ہوں؟"

میں یہ کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ وہی مشعل، وہی مقابلے، وہی موازنے، میرے لیے عذاب کوئی ایک نہیں ہے۔

............❀............

04-03-1987

آج بہت عجیب بات ہوئی تھی۔ کالج سے چھٹی ہونے پر میں سارہ کے ساتھ اس کی گاڑی کی طرف جا رہی تھی۔ وہی مجھے کالج پک اینڈ ڈراپ کیا کرتی تھی۔ کالج کے کار پارکنگ تک ہم ابھی پہنچے تھے کہ سترہ اٹھارہ سال کی ایک بہت خوبصورت سی لڑکی میرا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس طرح روکے جانے پر مجھے حیرت نہیں ہوئی تھی۔ لڑکیاں اکثر مجھے روک کر مجھ سے باتیں کیا کرتی تھیں۔

"مہرین! میرا نام لینا ہے، مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے کریں۔" میں نے مسکراتے ہوئے اسے کہا تھا۔

"نہیں مجھے یہاں نہیں کرنی آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں۔"

"دیکھیں لینا میں کسی کے گھر نہیں جاتی۔ پھر آپ سے تو ویسے بھی میں پہلی بار ملی ہوں۔"

میں نے اسے نرمی سے سمجھایا تھا۔

"ٹھیک ہے آپ میرے گھر نہ آئیں، میرے ساتھ آئیں میں آپ کو ڈراپ کر دوں گی۔"

"تھینک یو لیکن میں کسی سے لفٹ نہیں لیتی۔" وہ کچھ مایوس ہوئی تھی۔

"آپ کو مجھ سے اگر کچھ کہنا ہے تو یہیں کہہ دیں۔"

"مہرین آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ آپ میرا آئیڈیل ہیں۔ میں آپ کو اپنی دوست بنانا چاہتی ہوں۔"

اس نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا تھا۔ ایسا مطالبہ بھی میرے لئے نیا نہیں تھا۔ لمبی سانس لے کر مَیں نے اس سے کہا تھا۔

''آپ سمجھ لیں کہ آج سے آپ میری دوست ہیں۔''

میں نے وہی فقرہ دہرایا تھا جو میں اکثر ایسی صورت حال میں کہتی تھی اور اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ مگر اس نے مجھ سے ہاتھ ملانے کی بجائے یک دم رونا شروع کر دیا۔

''نہیں آپ یہ بات سب سے کہتی ہیں مگر میں آپ کی بیسٹ فرینڈ بننا چاہتی ہوں۔ میرا کوئی دوست نہیں ہے آپکو نہیں پتا میں آپ سے کتنی محبت کرتی ہوں، میں ساری رات آپ کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ میرے کانوں میں ہر وقت آپ کی آواز گونجتی رہتی ہے۔ میرے پاس سینکڑوں کی تعداد میں آپ کی تصویریں ہیں۔ ہر فنکشن میں میں صرف آپ کی تصویریں بنانے کے لئے کیمرہ لاتی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے میں ہر وقت آپ سے باتیں کرتی رہوں۔ میں کالج بھی صرف آپ کے لئے آتی ہوں۔''

میں اس کی باتوں سے زیادہ اس کے رونے پر چکرا گئی تھی۔ اسے چپ کروانے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے کہا:

''اچھا لینا دیکھو اگر تم واقعی مجھ سے محبت کرتی ہو تو چپ ہو جاؤ۔''

میری بات پر واقعی اس کے بہتے آنسو تھمنے لگے تھے۔

''ٹھیک ہے میں تمہاری دوست بن جاتی ہوں۔ ہم روز ملا کریں گے۔ کبھی تم میرے پاس آ جانا کبھی میں تمہارے پاس آ جایا کروں گی اور اب یہ نہ سمجھنا کہ یہ میں سب سے ہی کہتی ہوں۔ مجھے واقعی تم اچھی لگی ہو۔''

اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرانے لگی تھی۔ اس نے ہاتھ ملا کر میرا شکریہ ادا کیا۔

''اب میں جاؤں مجھے دیر ہو گئی ہے؟'' میں نے اس سے اجازت طلب کی تھی۔ "Oh sure" وہ کہہ کر چند قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

''اُف یہ تمہارے فین بھی کیا چیز ہوتے ہیں۔''

سارہ نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''کس کس کو شکار کرو گی تم ظالم؟'' میں اب بھی چپ رہی تھی۔ پتا نہیں لینا کے بہتے آنسو دیکھ کر مجھے کیوں اتنی تکلیف ہوئی تھی۔ اس کے نزدیک میں آئیڈیل تھی میں مہرین منصور اور جو کبھی وہ مشعل سے مل لیتی تو پھر میں اس کے نزدیک آئیڈیل نہ رہتی پھر میں شاید اس کے نزدیک کچھ بھی نہ رہتی۔

''پتا ہے میں جب گھر بھائی کو تمہارے مداحوں کی حالت زار کے بارے میں بتاتی ہوں تو انہیں یقین نہیں آتا کہ کوئی لڑکی بھی لوگوں کو اس طرح پاگل بنا سکتی ہے۔ مگر میں انہیں کہتی ہوں جناب یہ کوئی لڑکی نہیں ہے یہ مہرین منصور ہے اسے لوگوں کے دلوں کو جیتنا آتا ہے۔'' اس کی آواز میں بھی میری ذات پر فخر موجود تھا۔ اسے بھی لگتا تھا کہ میں بہت perfect ہوں۔

''تم کیوں مذاق اڑاتی ہو ان لوگوں کا۔ یہ اس لئے تو نہیں کہ تم اور تمہارا بھائی انہیں گوسپ کا موضوع سمجھیں۔''

میں نے کچھ خفگی سے اسے ڈانٹا تھا۔

''اوہ یار کبھی کبھی انجوائے کیا کرو ان باتوں کو، ان لوگوں کو، ہر وقت اتنی loyalty اچھی نہیں ہوتی۔ مانا کہ تم بہت مخلص، بہت نرم دل، بہت اچھی ہو مگر زندگی میں ہر شخص، ہر بات، ہر کام اتنی سنجیدگی سے لینے والا نہیں ہوتا'' اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''بہت فضول اور بے کار نصیحت ہے یہ۔ اور میں یقین دلاتی ہوں کہ کبھی بھی اس پر عمل نہیں کروں گی۔''

میں نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

''میں نے کب یہ سوچا ہے کہ محترمہ میری باتوں پر عمل کریں گی۔ جانتی ہوں آپ کی اپنی values ہیں اور آپ وہی کرتی ہیں جو سوچتی ہیں۔ ہم پھر بھی بکتے رہتے ہیں کہ چلو شاید کبھی کوئی اور ہی اس پر عمل کر لے۔'' میں خاموش رہی۔

''پھر میں نہیں آ رہی ہوں صبح، لیلیٰ کو میں نے کہہ دیا ہے وہ تمہیں پک کر لے گی۔''

اس نے گھر کے آگے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار لیلیٰ کو کیوں کہا ہے وہ تو ہمیشہ لیٹ آتی ہے میں خود چلی جاؤں گی۔ کبھی کبھی بندے کو اپنے وسائل بھی استعمال کرنے چاہئیں۔''

''ارے لیلیٰ کو میں نے کب کہا ہے وہ تو میں اسے بتا رہی تھی کہ میں کل کالج نہیں آ رہی تو اس نے خود ہی کہا تھا کہ سارہ پھر مہرین کو میں پک کر لوں گی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ تم بی بی اپنے بناؤ سنگھار سے فرصت پا کر بہت لیٹ گھر سے روانہ ہوتی ہو اور مس مہرین منصور اس قسم کی بے پروائی پسند نہیں کرتیں مگر اس نے کہا تھا کہ کم از کم وہ صبح بالکل ٹھیک وقت پر پہنچے گی۔ میں ایک دفعہ پھر فون کر کے اس کی ٹائمنگ کنفرم کر لوں گی ورنہ پھر میں صبح ڈرائیور کو بھیج دوں گی۔''

اس نے خود ہی پورا پروگرام سیٹ کر دیا تھا۔

''نہیں سارہ اب تم اس قسم کے تکلفات میں مت پڑو، میں آ جاؤں گی صبح، ایک دن ہی کی تو بات ہے۔''

میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا تھا۔ ''تکلفات میں تم پڑ رہی ہو اگر مجھے یہ سب کرتے ہوئے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی تو تمہیں کیوں ہو رہی ہے؟ خدا حافظ۔'' وہ گاڑی اڑاتے ہوئے لے گئی۔ میں کچھ دیر تک دور جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھتی رہی۔

میری فرینڈز ایسی ہی تھیں انہیں مجھ سے زیادہ میری پروا ہوتی تھی۔ میری ذمہ داریوں کو وہ خود ہی آپس میں بانٹتی رہتی تھیں۔ عام طور پر سارہ مجھے پک اور ڈراپ کیا کرتی تھی مگر کبھی جب اس کو نہیں آنا ہوتا تھا تو وہ خود ہی یہ ذمہ داری کسی کو سونپ دیا کرتی تھی اور مجھے انفارم کر دیا کرتی تھی۔ میں اخبار کے لئے جتنے بھی آرٹیکلز لکھتی تھی، رخشی اس کی پروف ریڈنگ کا کام کر دیتی تھی۔ وہ کمپیوٹر پر ان کا پرنٹ تیار کرتی اور پھر انہیں پوسٹ کر دیا کرتی تھی۔ اخبارات سے ان آرٹیکلز سے ملنے والی رقم اسی کے پتے پر آتی تھی اور میری باقی ڈاک بھی وہیں آتی تھی۔

لیلیٰ فنکشنز کے لئے میرا لباس اور دوسرے لوازمات کا انتخاب کیا کرتی تھی۔ اس کی چوائس بہت اعلیٰ ہوتی

تھی۔وہی ہر فنکشن کے لئے مجھے تیار کیا کرتی تھی۔شیبا فنکشنز کے لئے مختلف چیزیں تیار کرنے میں میری مدد کرتی تھی۔ debates میں اکثر وہی میری پارٹنر ہوتی تھی جب وہ ان چیزوں میں حصہ نہیں بھی لے رہی ہوتی تھی تب بھی نامکمل رہ جانے والی فائلز وہی مکمل کیا کرتی تھی۔اور سارہ ...... وہ تو پتا نہیں میرے لئے کیا کیا کرنا چاہتی تھی۔اخبارات میں چھپنے والی تصویریں اور آرٹیکلز وہی کاٹ کاٹ کر جمع کر کے مجھے دیتی رہتی تھی۔وہ میرے ہر فنکشن کی وڈیو بنایا کرتی تھی۔اور میں...... میں ان کے لئے کچھ بھی نہیں کر پاتی تھی۔جو واحد چیز جو میں ان کے لئے کرسکتی تھی، وہ اسٹڈیز میں ان کی مدد تھی۔نوٹس میں تیار کیا کرتی تھی اور پورا گروپ وہی نوٹس استعمال کیا کرتا تھا اور وہ اس پر ہی بہت مشکور رہتی تھیں حالانکہ یہ کچھ بھی نہیں تھا۔وہ میرے لئے جو کیا کرتی تھیں وہ بہت زیادہ تھا۔

گھر کے اندر آ کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میری ملاقات اسود سے ہوئی تھی۔وہ سیڑھیاں اتر رہا تھا۔مجھے دیکھ کر رک گیا۔

''کیسی ہو مہرین؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر کہا تھا میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں فوراً وہاں سے بھاگ جاؤں۔اس کی مسکراہٹ مجھے بہت اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔

''تم ہماری طرف آؤ نا کبھی۔امی کہتی ہیں کہ اب تم آتی نہیں ہو۔پرسوں ایک دعوت کر رہی ہیں امی۔مجھے جاب ملنے کی خوشی میں تم بھی آنا۔''

میں نے پہلی دفعہ سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔بہت عرصے کے بعد میں نے اتنے قریب سے اتنے غور سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔بلیک جینز کے ساتھ وہ سفید ہاف بازوؤں والی ٹی شرٹ پہنے بہت اچھا لگ رہا تھا۔خوبصورت تو وہ شروع سے ہی تھا مگر آج وہ پہلے سے زیادہ اچھا لگا تھا مجھے، شاید بہت عرصے بعد وہ میرے لئے مسکرایا تھا اس لئے۔

پھر اسی لمحے اوپر سیڑھیوں سے مشعل نیچے آئی تھی۔وہ اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"Made for each other" میرے ذہن میں ایک سوچ ابھری تھی۔''کیا اس سے پرفیکٹ کپل کوئی ہوسکتا ہے۔''

''پرسوں میری دوست کی برتھ ڈے ہے۔مجھے وہاں جانا ہے اس لیے میں نہیں آ سکوں گی۔انوٹیشن کے لیے شکریہ۔'' میں یہ کہہ کر اوپر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

کسی فرینڈ کی برتھ ڈے نہیں تھی پرسوں مگر میں وہاں جا کر فرسٹریشن کے ایک نئے دورے کا شکار نہیں ہونا چاہتی تھی۔وہاں مشعل ہوگی اور میں ہوں گی اور جہاں ہم دونوں ہوتے ہیں وہاں مقابلے ہوتے ہیں، موازنے ہوتے ہیں۔شکل وصورت کے، خوبیوں کے، کردار کے اور خاندان کے اور میں ہر موازنے میں ہارتی۔سو نہ جانا بہتر تھا۔

پھر اسود علی جو تبصرے میرے کردار کے بارے میں کرتا رہتا ہے وہ میں مشعل سے اکثر سنتی رہتی ہوں۔مجھے حیرت ہوتی ہے اس پر۔یہ وہ بندہ تھا جو منافق نہ ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔جسے منافقت سے نفرت تھی اور اب کیا وہ منافقت

نہیں کر رہا تھا؟ اگر وہ مجھے برا سمجھتا ہے تو باقی سب کی طرح مجھ سے قطع تعلق کر لے اور اگر وہ ایسا نہیں سمجھتا تو پھر میری پیٹھ پیچھے تبصرے نہ کرے۔

اس نے مشعل سے میرے بارے میں کہا تھا:

''مہرین جیسی لڑکیوں کے کمپلیکسیز دلدل کی طرح ہوتے ہیں، وہ جتنا ان سے باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہیں اتنا ہی اندر دھنس جاتی ہیں۔''

میں چند دن پہلے مشعل سے یہ بات سن کر ہنس پڑی تھی حالانکہ میں جانتی تھی کہ میرے چہرے کا رنگ دھواں دھواں ہوگا۔

''اور کیا کہتا ہے وہ میرے بارے میں؟''

''کیا کیا سنو گی؟ بہت شرم آئے گی تمھیں اپنے بیسٹ فرینڈ کے ریمارکس سن کر۔'' وہ فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''وہ میرا بیسٹ فرینڈ نہیں ہے۔''

''چلو جو بھی ہے، پتا ہے وہ مجھے کہتا ہے کہ میں تمھارے ساتھ زیادہ میل جول نہ رکھوں۔ وہ نہیں چاہتا کہ میرا کردار بھی تمھارے جیسا ہو جائے۔ گھٹیا اور تھرڈ کلاس۔''

''بہت اچھی بات ہے، عمل کیا کرو اس کی نصیحتوں پر۔'' میں نے کھانا کھاتے ہوئے اپنا اطمینان ظاہر کیا تھا۔ وہ کچھ دیر میرے سر پر کھڑی مجھے دیکھتی رہی تھی پھر پاؤں پٹختے ہوئے اندر چلی گئی اور اب اسود کہہ رہا تھا کہ میں اس کے گھر جاتی نہیں ہوں۔

............❁............

05-12-1989

مجھے لگتا ہے مجھے اسفند سے محبت ہو گئی ہے یا شاید عشق یا پتا نہیں کیا مگر پتا نہیں کیوں اس کا چہرہ دیکھے بغیر اس کی آواز سنے بغیر میں زیادہ دن نہیں رہ سکتی۔ وہ کہتا ہے مجھے دنیا میں اس سے زیادہ کوئی نہیں چاہ سکتا، نہ اب نہ پھر کبھی اور پتا نہیں کیوں مگر اس کے ہر لفظ پر مجھے اعتبار آ جاتا ہے۔

مجھے آج بھی اس سے اپنی پہلی ملاقات یاد ہے۔ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیے مجھے صرف چند دن ہوئے تھے جب ایک سہ پہر میں شیبا کے ساتھ اس کے گھر گئی تھی۔ اس کی لائبریری میں کچھ کتابیں دیکھنی تھیں مجھے۔

''تم چلو لائبریری میں، میں ذرا کپڑے بدل کر اور کچھ کھانے پینے کا کہہ کر آتی ہوں ملازم کو۔'' شیبا نے گھر کے اندر داخل ہوتے ہی مجھے کہا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور میں اس کی امی سے ملنے کے بعد لائبریری کی طرف چلی گئی تھی۔ میں اس کے گھر آتی جاتی رہتی تھی اس لیے لائبریری میں بھی میرا کافی آنا جانا رہتا تھا۔ لائبریری میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ لیکن وہاں موجود کمپیوٹر آن تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کچھ دیر پہلے کوئی وہاں بیٹھ کر کام کر رہا تھا۔ میں نے لائبریری میں ان بکس

کو دیکھنا شروع کر دیا جن کی مجھے ضرورت تھی۔

وہاں مجھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ دروازہ کھول کر بلیو جینز اور اسی کلر کی شرٹ میں ملبوس ایک اونچا لمبا بندہ اندر آیا تھا۔

''ہیلو''

مجھے دیکھ کر اس نے اس طرح گریٹ کیا تھا جیسے وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہو۔ میرے پاس رکے بغیر وہ کمپیوٹر کی طرف بڑھ گیا تھا اور وہاں چیئر پر بیٹھ کر اس نے کمپیوٹر کو آپریٹ کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں کچھ لمحے اس کی پشت کو دیکھتی رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے رکنا چاہیے یا چلے جانا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ میں وہاں سے جانے کا فیصلہ کرتی اس نے کہا تھا۔

''آپ کیسی ہیں مہرین؟''

اس کے منہ سے اپنا نام سن کر میں حیران رہ گئی تھی۔ اپنے ہاتھ میں رکھی ہوئی کتابیں شیلف پر رکھ کر میں اس کی طرف چلی گئی۔ وہ اسکرین پر نظریں جمائے کی بورڈ پر ہاتھ چلا رہا تھا۔

''آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں؟'' میرے سوال پر کمپیوٹر سے نظر ہٹائے بغیر اس نے کہا۔

''بیٹھ جائیں۔'' میں اس کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''پانی پئیں گی؟'' میرے بیٹھتے ہی اس نے پوچھا تھا۔

''نہیں۔''

''تو پلیز مجھے گلاس میں ڈال دیں۔''

میں اس کے مطالبے پر حیران ہوئی تھی مگر میں نے سامنے پڑے ہوئے جگ سے ایک گلاس بھر کر کمپیوٹر کے پاس رکھ دیا۔ اس نے کمپیوٹر پرنٹر سے کچھ کاغذ باہر نکالتے ہوئے بائیں ہاتھ سے پانی کا وہ گلاس اٹھا کر پینا شروع کر دیا۔

''تھینک یو، آپ نے پوچھا تھا کہ میں آپ کا نام کیسے جانتا ہوں، میں آپ کا نام نہیں اور بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔''

گلاس رکھ کر اس نے ایک بار پھر کی بورڈ پر ہاتھ چلاتے ہوئے کہا تھا۔

''مثلاً؟'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''مثلاً یہ کہ آپ شیبا کی دوست ہیں۔ بہت intelligent ہیں۔ بہت زبردست قسم کی orator ہیں۔ straight forward ہیں۔ نرم دل کی مالک ہیں۔ انگریزی میں شاعری کرتی ہیں۔ آرٹیکلز لکھتی ہیں۔ بہت بہادر ہیں، اصول پرست ہیں، لوگوں کے بہت کام آتی ہیں۔ آپ کو لوگوں کا دل جیتنا آتا ہے، بقول شیبا کے جادو آتا ہے۔ لوگوں کو اکثر لاجواب کر دیتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔'' وہ کمپیوٹر کی اسکرین پر نظریں جمائے دھیمی آواز میں یوں بولتا گیا تھا جیسے یہ سب اسکرین پر لکھا ہوا تھا۔

کچھ دیر تک میں چپ بیٹھی رہی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں۔

''آپ کون ہیں اور میرے بارے میں یہ سب کیسے جانتے ہیں؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''میں شیبا کا کزن ہوں اسفند عثمان اور اس گھر میں کون ہے جو آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا؟ کچھ شیبا بتاتی رہتی ہے۔ کچھ آپ کی وڈیوز دیکھ کر پتا چلتا رہتا ہے۔'' میں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

''آپ کچھ نہیں پوچھیں گی میرے بارے میں؟''

یک دم اس نے کہا تھا۔

''مثلاً کیا؟''

''مثلاً یہ کہ میں کیا کرتا ہوں، کیا مشاغل ہیں میرے؟''

''نہیں۔'' پہلی دفعہ اس نے کمپیوٹر اسکرین سے مسکراتے ہوئے نظر ہٹائی تھی۔

''کیوں نہیں پوچھیں گی؟''

''کیونکہ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' میں کرسی سے کھڑی ہوگئی تھی۔ یک دم میرا جی اچاٹ ہوگیا تھا ہر چیز سے، اس کے منہ سے اپنا یہ تفصیلی تعارف مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔

میں لائبریری سے نکل آئی تھی۔ شیبا مجھے کوریڈور میں ملی تھی۔

''میں نے کتابیں لے لی ہیں۔'' میں نے اسے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابیں دکھاتے ہوئے کہا۔ پھر میں شیبا کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئی تھی۔

اس سے میری دوسری ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی تھی جب شیبا نے اس سے میرا تعارف کروایا، اس نے بھی لٹریچر میں ماسٹرز کرنے کے لیے ایڈمیشن لیا تھا۔ وہ انگلینڈ سے آیا تھا وہاں وہ شروع ہی سے کمپیوٹر سائنسز پڑھتا آ رہا تھا۔ اب یکدم لٹریچر کی طرف رجحان سمجھ میں نہ آنے والی چیز تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''لٹریچر میں انٹرسٹ ہے؟''

"Not exactly"

''تب پھر ٹائم ویسٹ کیوں کر رہے ہیں؟ ویسے بھی جو کتابیں ہم ماسٹرز میں پڑھ رہے ہیں آپ تو یہ ہائی اسکول میں پڑھ چکے ہیں۔ شیبا نے بتایا تھا مجھے اور ویسے بھی کمپیوٹر سائنسز میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ اباؤٹ ٹرن کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آفٹر آل انگلش کوئی پروفیشنل سبجیکٹ تو ہے نہیں۔''

''ہاں مگر میں لٹریچر کسی اور مقصد کے لیے پڑھ رہا ہوں۔'' اس وقت اس نے مجھے نہیں بتایا کہ وہ لٹریچر کس اور مقصد کے لیے پڑھ رہا ہے مگر چند ہفتوں کے بعد اس کے مقصد کا پتا مجھے چل گیا تھا۔ جب ایک دن میں لائبریری میں بیٹھی کچھ نوٹس بنا رہی تھی۔

''ایکسکیوزمی مہرین، میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہ رہا ہوں۔''

اسفند نے میرے قریب آ کر کہا تھا۔ میں اپنی فرینڈز سے ایکسکیوز کرتے ہوئے اس کے ساتھ لائبریری

سے باہر آ گئی تھی۔

''کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟'' باہر آتے ہی اس نے مجھ سے کہا تھا میں اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔

''میں اپنے پیرنٹس کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں مگر سوچا پہلے آپ سے بات کرلوں۔'' وہ بہت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

''دیکھیں اسفند آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور پھر میں نے ابھی شادی کے بارے میں نہیں سوچا کم از کم اپنی تعلیم مکمل کرنے تک تو میں ایسا کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔'' میں نے اپنے حواسوں پر قابو پالیا تھا۔

''میں آپ کے بارے میں جتنا جانتا ہوں کافی ہے۔ ہاں آپ کی دوسری بات کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔ دیکھیں مجھے کوئی جلدی نہیں ہے آپ جتنا سوچنا چاہتی ہیں سوچ لیں اگر تعلیم ختم کرنے کے بعد شادی کرنا چاہتی ہیں تب بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں صرف فارملی ایک بار اپنا پروپوزل آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔ آپ اس کے بارے میں سوچ لیجئے گا۔'' وہ یہ کہہ کر چلا گیا تھا۔

بہت دنوں تک میں حیران رہی تھی پھر میں نے شیبا سے بات کی تھی وہ اس پروپوزل سے بے خبر نہیں تھی۔ اسفند نے مجھے پروپوز کرنے سے پہلے اس سے بھی بات کی تھی۔

''دیکھو مہرین اسفند ایسا بندہ ہے کہ جو مجھے پروپوز کرتا تو میں آنکھیں بند کر کے اس پروپوزل کو قبول کر لیتی۔ وہ پڑھا لکھا ہے دولت مند ہے بہت خوبصورت ہے مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کردار بہت اچھا ہے اس کا۔ امریکہ میں رہنے کے باوجود اس نے وہاں کی کوئی برائی نہیں اپنائی، نہ ہی اس پر انگلینڈ میں رہنے کا کوئی اثر ہوا ہے۔ تم سے پہلے اس نے کبھی کسی لڑکی میں دلچسپی نہیں لی اس کا واحد Passion کمپیوٹر تھا مگر جب سے وہ ہمارے گھر ہے اور جب سے اس نے تمہارے بارے میں جاننا شروع کیا تھا۔ وہ بہت دلچسپی لینے لگا تھا تم میں۔ بہت کرید کرید کر پوچھتا تھا تمہارے بارے میں۔

اور یہ جو اس نے ماسٹرز میں ایڈمیشن لیا ہے نا یہ بھی صرف اس لیے کہ وہ تمہیں قریب سے جاننا چاہتا ہے۔ میں نہیں سمجھتی اس سے Perfect match کوئی اور تمہیں مل سکتا ہے۔'' شیبا نے اس کے حق میں ایک تقریر کر دی تھی۔ میں خاموش ہو گئی تھی۔

کچھ دن بعد اسفند نے دوبارہ مجھ سے اس سلسلے میں بات کی تھی اور میں نے اسے کہا تھا کہ وہ ابھی اپنا پروپوزل نہ بھیجے۔ ابھی کچھ ماہ میں اس سلسلے میں سوچنا نہیں چاہتی۔ اُس نے میرے مطالبے کو قبول کر لیا تھا۔

اور پھر میرے اور اس کے درمیان بہت عجیب طریقے سے انڈرسٹینڈنگ ہونا شروع ہو گئی تھی۔ وہ بہت نائس بندہ ہے بہت کم بولتا ہے۔ وہ بہت مددگار قسم کا انسان ہے میں نے آج تک اسے کسی کی مدد کرنے سے انکار کرتے ہوئے نہیں دیکھا اور مجھے یہ سب پسند ہے۔ میرے لیے وہ بہت protective ہے۔

بہت سے لوگ مجھ پر توجہ دیتے ہیں، میری پروا کرتے ہیں جیسے میری فرینڈز مگر اسفند کے انداز میں کوئی اور

بات ہے۔ میرے لیے اس کا رویہ کچھ خاص ہوتا ہے۔ وہ میرے لیے جان دینے کے دعوے نہیں کرتا مگر مجھے لگتا ہے وہ میرے لیے جان دے سکتا ہے۔ میں چاہتی ہوں مجھے ساری دنیا اس کی آنکھوں سے دیکھے اس محبت، اس مانوسیت، اس عزت کے ساتھ جس کے ساتھ وہ مجھے دیکھتا ہے۔

جب میں اس کے بارے میں سوچتی ہوں تو پوری دنیا مجھے خوبصورت نظر آنے لگتی ہے۔ کچھ بھی بھیانک کچھ بھی بدصورت نظر نہیں آتا۔ نہ اپنا ماضی نہ اپنے حالات نہ لوگ، کچھ بھی نہیں۔ وہ مجھے کبھی نہیں کہتا کہ میں اس کے ساتھ کہیں باہر پھرنے کے لیے جاؤں۔ کسی پارک میں، کسی کیفے میں، کسی ریسٹورنٹ میں۔ وہ کبھی یہ بھی نہیں کہتا کہ میں اسے فون کروں یا وہ مجھے فون کرے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا میں اس کے ساتھ سارا دن یونیورسٹی کے لان، کیفے ٹیریا یا لائبریری میں بیٹھی رہوں۔ ہم روز صرف دس پندرہ منٹ کے لیے ملتے ہیں کبھی ایک دو گھنٹہ بھی ہو جاتا ہے اور عجیب بات ہے ہمیں اپنی بات ایک دوسرے تک پہنچانے کے لیے تنہائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔

دوستوں کے پاس بیٹھے ہوئے بھی یہ احساس کہ اسفند میرے سامنے بیٹھا ہے میرے لیے کافی ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے چہرے کو بیس منٹ میں ایک لحہ کے لیے بھی دیکھ لینا ایسا لگتا ہے جیسے ہم بیس منٹ سے ایک دوسرے پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ پتا نہیں اس کے سامنے میں بولنا کیوں نہیں چاہتی میں صرف سنتی رہنا چاہتی ہوں اس کی باتیں، اس کی آواز۔ وہ سارہ سے باتیں کرے یا رخشی سے مجھے لگتا ہے جیسے وہ مجھ سے مخاطب ہے۔ اور کیا محبت اس کے سوا کوئی چیز ہے۔

اور بعض دفعہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے میں سوچتی ہوں اگر یہ جان جائے کہ مہرین منصور کا باپ کون تھا تو کیا پھر بھی اس کی آنکھوں میں میرے لیے یہی عزت محبت ہوگی؟ نہیں کبھی نہیں اور میں ہمیشہ اس سے یہ بات چھپاؤں گی ورنہ میں کیسے برداشت کروں گی کہ میں جس کے لیے سب کچھ ہوں اس کے لیے کچھ بھی نہ رہوں۔ کوئی مجھے یوں پھینک دے جیسے میں استعمال شدہ کاغذ ہوں جیسے اسود نے کیا تھا اور اگر اسفند نے ایسا کیا تو میں کیسے زندہ رہوں گی؟ پر وہ ایسا کیوں کرے گا میں جانتی ہوں وہ کبھی بھی ایسا نہیں کرے گا۔

اور کبھی جب وہ کہتا ہے کہ مجھے اس سے زیادہ کوئی نہیں چاہ سکتا تو میرا دل چاہتا ہے میں اس سے کہوں کیا تمہیں بھی مجھ سے زیادہ کوئی چاہے گا؟ پر میں یہ نہیں کہتی۔ اس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اور اب میری سمجھ میں آتا ہے کہ لینا گردیزی میرے لیے کس طرح بے قرار رہتی ہے وہ جو مجھ سے کہتی ہے "پتا ہے میں آپ کو نہ دیکھوں تو مجھے لگتا ہے جیسے کچھ missing ہے جیسے ہر چیز نامکمل ہے اور میں اس missing link کو ڈھونڈنے کے لیے یہاں یونیورسٹی میں آئی ہوں۔"

مجھے اس کی باتوں پر کچھ یقین آتا تھا کچھ نہیں پر اب اس کی بات مجھے وحی لگنے لگتی ہے۔ ہاں ایسا ہی ہوتا ہے، میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے جب میں اسفند کو نہ دیکھوں میرا دل چاہتا ہے میں اسفند سے یہ سب کہوں وہ مجھے کہتی ہے۔

"میرا جی چاہتا ہے کبھی آپ مجھ سے کوئی ایسی چیز مانگیں جس کا حصول بہت مشکل ہو اور پھر میں حاتم طائی

کی طرح پوری دنیا میں اسے ڈھونڈتی پھروں۔ وہ مل جائے تو اسے لے آؤں نہ ملے تو کبھی آپ کے پاس نہ آؤں مگر آپ تو کچھ کہتی ہی نہیں ہیں۔"

میری آنکھیں اس کی باتیں سن کر بھیگنے لگتی ہیں۔ ہاں میرا دل بھی چاہتا ہے کبھی اسفند مجھ سے کچھ مانگے تو میں بھی اس چیز کو نگر نگر ڈھونڈتی پھروں۔

"آپ چلتی ہیں نا تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے آپ کو کبھی کوئی گرا نہیں سکتا۔ کوئی آپ کا راستہ نہیں روک سکتا۔ آپ دیکھتی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے سامنے والے کے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں۔ آپ بولتی ہیں تو جی چاہتا ہے دنیا میں صرف آپ کی آواز گونجے باقی ہر آواز ختم ہو جائے۔"

وہ اپنی باتوں سے مجھے دہلا دیا کرتی ہے۔ مجھے خوف آنے لگتا ہے اس کی محبت، اس کی عقیدت سے اور اب جب میں اسفند کو دیکھتی ہوں تو مجھے لینا کی باتیں یاد آنے لگتی ہیں، پھر میں اسفند کے چہرے سے نظر ہٹا لیتی ہوں ہاں مجھے لگتا ہے مجھے اسفند سے محبت ہو گئی ہے۔

❁

02-01-1990

پچھلے چھ سال کے دوران آج پہلی مرتبہ سارہ مجھ سے ناراض ہو گئی ہے اور آج کل تو ہر ایک ہی مجھ سے خفا ہے پر اسے تو سمجھنا چاہیے جو چیز وہ مجھ سے چاہتی ہے وہ بہت زیادہ ہے میں اس کے بھائی سے شادی نہیں کر سکتی اب جب میری زندگی میں اسفند ہے اور وہ تو کچھ سننے پر تیار نہیں ہے۔

"مہرین تم جانتی ہو عارفین بھائی تمہیں پسند کرتے ہیں اور آج سے نہیں پچھلے کئی سالوں سے۔"

میں نے اس کی امی کی طرف سے اچانک اس کے بھائی کا پروپوزل لانے پر اسے فون کیا تھا اور اس نے مجھے یہ جواب دیا تھا۔

"ہاں میں جانتی ہوں وہ مجھے پسند کرتے ہیں مگر ہم بہت سے لوگوں کو پسند کرتے ہیں لیکن سب سے شادی تو نہیں کرتے اور پھر میں نہیں جانتی تھی کہ وہ مجھے اس لحاظ سے پسند کرتے تھے میرے لیے تو وہ بھائی جیسے ہیں۔ میں نے کبھی ان کے بارے میں ایسے نہیں سوچا۔"

"پہلے نہیں سوچا تو اب سوچ لو بہر حال تمہیں میری بات ماننی ہے۔"

"سارہ تم مجھے پریشان مت کرو میں پہلے ہی لینا گردیزی کی وجہ سے بہت پریشان ہوں اور اب تم بھی وہی حرکت کر رہی ہو۔"

"میں تمہیں لینا گردیزی والے مسئلے سے نجات دلوانے کے لیے ہی اپنے بھائی کا پروپوزل دے رہی ہوں شاید وہ اپنے بھائی کا پروپوزل نہ لاتی تو میں اتنی جلدی یہ پروپوزل نہ بھجواتی مگر اب تمہیں ہاں کرنی ہی ہے۔"

وہ بڑے یقین سے کہہ رہی تھی۔ میں نے اس سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''اور اگر میں تمھیں یہ کہوں کہ میں کسی اور میں انٹرسٹڈ ہوں۔''

سارہ میرے اور اسفند کے بارے میں نہیں جانتی تھی سو اس نے بڑے پرسکون انداز میں کہا۔

"I can't believe it"

''لیکن یہ سچ ہے'' میں نے اسے کہا تھا اور پھر اپنے اور اسفند کے بارے میں بتا دیا وہ بہت دیر تک چپ رہی تھی۔ اتنی چپ کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ شاید وہ فون رکھ کر چلی گئی ہے مگر پھر وہ یک دم بول اٹھی تھی۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم میری دوست ہو، تمھیں بھی باتیں چھپانا آ گیا ہے اور وہ بھی مجھ سے اور اتنی اہم بات اور میں واقعی بے وقوف ہوں مجھے جان لینا چاہیے تھا کہ یہ بندہ جو روز تمھارے پاس آن وارد ہوتا تھا یہ شیبا کا کزن ہونے کی وجہ سے نہیں تھا وہ تمھیں پھانس رہا تھا۔ اچھا کیا تم نے مجھے اتنے اہم معاملے سے دور رکھا کم از کم مجھے اپنی اہمیت کا اندازہ تو ہو گیا ہے بہرحال اب اگر تمھیں میری ضرورت محسوس ہو تو میرے بھائی کا پروپوزل قبول کر لینا اور اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو مہرین پھر ہمارے درمیان دوستی نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہے گی۔'' اس نے میرا جواب سنے بغیر فون بند کر دیا تھا اور چار دن پہلے اسی طرح لینا گریزی نے مجھے کہا تھا۔

''آپ نے بھی مجھے دوسروں کی طرح let down کر دیا ہے۔ میری محبت ابھی تک آپ پر کوئی اثر نہیں کر سکی۔ آپ نہیں جانتیں میں نے کتنی ضد، کتنی لڑائی کر کے بھائی اور بابا کو اس رشتہ کے لیے تیار کیا تھا اور اب میں ان کے سامنے کس منہ سے جاؤں گی انھیں کیا کہوں گی؟ میں انھیں یہی کہتی رہی ہوں کہ آپ مجھ سے بے تحاشا محبت کرتی ہیں اور میری بات کو کبھی رد نہیں کریں گی۔

میں نے بہت غلط کیا آپ سے دوستی کر کے، آپ سے محبت کر کے، آپ کی نظر میں تو میری کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔''

اس نے بھی سارہ کی طرح میری بات سنے بغیر فون رکھ دیا تھا۔ وہ اور سارہ چاہتی ہیں کہ میں اسفند کو چھوڑ دوں، میں ان کی بات مان لوں لیکن میں کیسے ان کی بات مان لوں میں کیسے اپنی آنکھوں کی روشنی کو ختم کر دوں؟ وہ جس کی وجہ سے مجھے اپنے ہونے کا یقین آیا ہے میں کیسے اس یقین کو گنوا دوں جس کے بارے میں سوچنے سے مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرے اردگرد دور تک سبزہ ہی سبزہ پھیل گیا ہے اور میں ننگے پاؤں بیلے ڈانسر کی طرح اس سبزے پر رقص کرتی جا رہی ہوں اور کسی ماضی کا کوئی حوالہ میری راہ میں پتھر بن کر نہیں آ رہا۔

میں اسفند کے بغیر نہیں رہ سکتی، اور جو یہ سکون سا میرے اندر ہے یہ بھی اس کی بدولت ہے۔ اب کوئی مشغل مجھے بری نہیں لگتی، مجھے اس سے نفرت محسوس نہیں ہوتی، مجھے کسی سے بھی نفرت محسوس نہیں ہوتی اور میں ایسی ہی رہنا چاہتی ہوں، سراپا محبت بن کر اور یہ سب ہو سکتا ہے صرف ایک شخص کے میری زندگی میں شامل ہو جانے سے، میں سب کچھ پیچھے چھوڑ آئی ہوں، وہ کیچڑ سے بھری ہوئی لاش بھی اب مجھے رات کو ڈراتی نہیں ہے، نہ میرے رگ و پے میں یہ خوف دوڑتا رہتا ہے کہ اگر کہیں جو کسی کو یہ پتا چل گیا کہ میرا باپ کون تھا تو کیا ہوگا، لوگ میرے بارے میں کیا سوچیں گے کیا کہیں گے؟

میں سارے کمپلیکسز کو بہت پیچھے چھوڑ آئی ہوں، خود کو حوالوں کی دلدل سے نکالنے کے لیے میں نے بہت جدوجہد کی ہے، اب مہرین کو اپنی پہچان کے لیے کسی دوسرے کے نام کی ضرورت نہیں پڑتی۔ نہ نام ونسب کا کانٹا میرے پیر کو زخمی کرتا ہے نہ عام شکل وصورت کا طوق مجھے وزنی لگتا ہے۔

میں نے خود کو اپنی محنت سے excel کیا ہے۔ ان سے جن کے چہرے دیکھ کر دنیا خوبصورت لگنے لگتی ہے، ان سے جن کا شجرۂ نسب دیکھ کر جی ان کا غلام بن جانے کو چاہتا ہے، ان سے جن کی دولت دیکھ کر حسد ہونے لگتا ہے اور مہرین منصور نے ان سب سے ستائش پائی ہے اور اسفند عثمان اس مہرین منصور کی واحد خواہش ہے اور سارہ چاہتی ہے میں اسے بھول جاؤں اسفند عثمان کو۔

اور اس دن جب میں نے کیفے ٹیریا میں بیٹھے بیٹھے یک دم رابعہ کے آگے ہاتھ پھیلا دیا تو وہ چونک پڑا۔

''ذرا دیکھو رابعہ میرا فیوچر کیسا ہے؟''

میں جو کبھی بھی پامسٹری پر یقین نہیں رکھتی تھی پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا تھا اپنے کل کے بارے میں جاننے کا۔

''کیا جاننا چاہتی ہیں آپ؟'' رابعہ کی بجائے اس نے مجھ سے کہا تھا۔

''بس یہ کہ کیا میں آئندہ زندگی میں خوش رہوں گی۔'' وہ میری بات پر مسکرا دیا تھا رابعہ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''یار ہاتھ دکھانے کی ضرورت ہم جیسے لوگوں کو پڑتی ہے، تم جیسے نامی گرامی لوگوں کو اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے؟ تم لوگ تو مقدر کے سکندر ہو اور پھر تم تو ویسے ہی بہت ہاتھ دکھاتی رہتی ہو۔'' شیبا نے مجھ سے کہا تھا۔

میں چپ رہی تھی۔ صرف رابعہ کے چہرے کو دیکھتی رہی جو بہت غور سے میرا ہاتھ دیکھ رہی تھی۔

''بھئی اتنی دیر کیوں؟ کیا کوئی خزانے کا نقشہ نظر آ گیا ہے ہاتھ پر؟''

اس بار رخشی نے اسے کہا تھا۔

''نہیں خزانے کا نقشہ نہیں مگر یہ ہاتھ بہت عجیب ہے۔ بہت مشکل، شاید میں کوئی صحیح پیش گوئی نہ کر پاؤں کیونکہ میں اسے سمجھ نہیں پا رہی۔ مہرین کی زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ جیسا ہونا چاہیے ویسا نہیں ہے بہرحال کوشش کرتی ہوں کہ کچھ بتاؤں، کوئی کرائسس آنے والا ہے تمہاری زندگی میں بہت بڑا کرائسس۔ ایک دم سے تم گمنامی کی زندگی میں چلی جاؤ گی، بہت سے لوگ تم سے قطع تعلق کریں گے شاید تم mental disorder کا شکار ہو جاؤ شاید تعلیم کا سلسلہ بھی جاری نہ رہے۔''

وہ اٹکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

اسفند نے اچانک بہت نرمی سے میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑایا تھا۔

''کیا بکواس ہے بھئی، چھوڑو اس قسم کی باتوں کو، کوئی ڈھنگ کی بات کرو۔'' اس نے کہا تھا۔

''شاید سورج مشرق سے نکلنا بند کر دے، شاید تارے نظر آنا بند ہو جائیں شاید ایک کی بجائے پانچ چاند نظر

آنے لگیں، شاید انسان سانس لیے بغیر زندہ رہنا شروع کر دے۔ آپ کے اگلے جملے یقیناً یہی ہونے چاہئیں مس رابعہ قدیر۔''

رخشی نے چپس کھاتے ہوئے کہا۔

''ویسے بی بی یہ خاتون دوسروں کا مینٹل بیلنس خراب کرتی ہیں اپنا نہیں۔ ویسے گمنامی میں جانے پر غور ہو سکتا ہے اور تعلیم چھوڑنے پر بھی کیونکہ ان دونوں کاموں سے ہمارا تو بہت بھلا ہوگا چار بندے ہمیں بھی جان لیں گے۔''

سارہ واضح طور پر رابعہ کا مذاق اڑا رہی تھی۔

''ویسے بھئی میں تو کل صبح تک کے لیے تم سے قطع تعلق کر رہی ہوں مجھے آج ذرا جلدی گھر جانا ہے، خیر رابعہ بی بی بہت دل خوش کیا آپ نے ہمارا۔ ملتی رہا کیجئے اللہ آپ کے علم میں اور اضافہ کرے۔'' شیبا نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔

''بھئی میں نے کہا تھا نا کہ مجھے اس ہاتھ کی سمجھ نہیں آ رہی اور ویسے بھی ضروری نہیں جو میں نے کہا وہی ہو جائے مجھے تو خود بھی ایسا ہوتا نہیں لگ رہا مگر ہاتھ کی لکیریں کچھ اسی قسم کی ہیں۔'' رابعہ نے جھینپتے ہوئے کہا تھا۔

اور اس دن کیفے ٹیریا سے باہر نکلتے ہوئے اسفند نے کہا تھا۔

''ان باتوں کو سنجیدگی سے مت لینا۔ ایسی باتیں صرف انجوائے کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔''

''کیوں کیا یہ سچ نہیں ہوسکتیں؟'' میں نے اس سے پوچھا تھا۔

''کم از کم تمھارے لیے نہیں، مہرین تم لوگوں پر اس قدر مہربان اتنی down to earth ہو کہ یہ چیزیں تمھارے لیے کبھی سچ نہیں ہوسکتیں۔ تم نے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی تو خدا تمھیں ایسی تکلیف کیسے پہنچا سکتا ہے؟''

اور میں نے سوچا تھا کہ ہاں واقعی یہ سب کیسے ہوسکتا ہے، میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا تو کوئی میرے راستے میں کانٹے کیسے بچھا سکتا ہے؟

اور اب جب سارہ اور لینا مجھ سے ناراض ہیں تب بھی کوئی واہمہ مجھے پریشان نہیں کر رہا، ابھی کوئی بھی چیز میرے بس سے باہر نہیں ہوئی ہے۔ میں انھیں منا لوں گی۔ آخر وہ میری فرینڈز ہیں وہ میری بات کیوں نہیں سمجھیں گی۔

............❀............

17-01-1990

اور آج مجھے اسود علی سے منسوب کر دیا گیا ہے اور اپنے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنائی گئی انگوٹھی مجھے ایک ننھا سا سانپ لگ رہی ہے جو بار بار مجھے ڈس رہا ہے اور میں اسے جھٹک نہیں سکتی، میں کچھ بھی نہیں کر سکتی، اور اسفند عثمان جو دو دن پہلے تک مجھے روکنے کی کوشش کرتا رہا تھا آج اس نے مجھے فون پر کہا تھا۔

''جب تمھاری کزن مشعل مجھے تم سے خبردار کرنے آیا کرتی تھی تو میں اسے بے وقوف سمجھتا تھا۔ میں سوچتا

تھا وہ حسد کا شکار ہے مگر اب مجھے احساس ہوا ہے کہ ایسا نہیں تھا وہ سچ کہتی تھی۔ تم ایک فراڈ، ایک selfish لڑکی ہو اور میں جو پچھلے دو سال سے اس الووژن کا شکار تھا کہ میں جس سے محبت کرتا ہوں وہ سب سے منفرد، سب سے مختلف لڑکی ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتی، وہ دھوکا نہیں دیتی مگر تم مہرین منصور، تم تو شاید جھوٹ کے علاوہ کچھ بولتی ہی نہیں ہو، اور میں کتنے بڑے فریب کا شکار رہا ہوں مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب میرے ساتھ تم نے کیا ہے۔"

میں نے فون بند کر دیا تھا اس سے زیادہ مجھے کیا سننا تھا اور میرا دل چاہا تھا میں اس سے کہوں، میں نے تمھیں دھوکا نہیں دیا۔ یہ کام اگر مجھے آ جاتا تو میں ہمیشہ خوش رہتی اور میں جسے یہ گمان تھا کہ میں سب کچھ کر سکتی ہوں جو یہ سمجھتی تھی کہ پوری دنیا میرے ہاتھ میں ہے میں غلط تھی۔

میں نے آج بھی وہی کیا تھا جو میں نے سترہ سال پہلے اپنے باپ کی لاش دیکھنے پر کیا تھا۔ تب میں بیڈ کے نیچے چھپ گئی تھی اور اب میں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ میرے ہاتھ میں انگوٹھی پہناتے ہوئے عفی خالہ بہت خوش تھیں۔ امی بہت مسرور تھیں اور میں سوچ رہی تھی ہر ایک نے مجھ سے اپنی نوازشوں اپنے احسانوں کی قیمت وصول کرنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے اور عفی خالہ نے مجھ سے بات کیے بغیر امی سے میرا رشتہ مانگا تھا اور امی نے میری مرضی جانے بغیر ہاں کر دی تھی اور جب انھوں نے مجھے یہاں آ کر یہ بات بتائی تھی تو میں بہت دیر تک انھیں دیکھتی رہی تھی۔

ان کے ہاتھ اسی طرح سونے کی چوڑیوں سے بھرے ہوئے تھے جیسے میری ممانیوں یا عفی خالہ کے ہوتے تھے اور ان چوڑیوں کے لیے وہ سولہ سال پہلے مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھیں لیکن مجھے ان سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ انھوں نے اچھا کیا، بہت اچھا کیا، میرے لیے اپنی زندگی خراب نہیں کی اور اب وہ میری زندگی خراب کرنا چاہتی تھیں۔

"عفی تم سے بہت پیار کرتی ہے اور پھر اسود تو لاکھوں میں ایک ہے۔ میں تو عفی کو انکار کر ہی نہیں سکی۔ اس نے اتنے پیار سے تمہارا رشتہ مانگا ہے میں نے اسے کہا کہ تم سمجھو مہر و تمہاری بیٹی ہے جب چاہو اسے بیاہ کر لے جاؤ۔"

انھوں نے مجھے بتایا تھا میرے حلق میں بہت سے کانٹے اُگ آئے تھے۔

"میں نے عفی کو کہا ہے جمعہ کو تمھیں انگوٹھی پہنانے آ جائے، ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

وہ میرا ماتھا چوم کر کمرے سے نکل گئی تھیں اور اسفند ایک پل میں میری زندگی سے نکل گیا تھا اور مجھے لگا تھا جیسے کوئی میرا گلا گھونٹ رہا ہے، جیسے کسی نے میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔ میں جیسے خلا میں معلق تھی۔ میں نے تو کبھی کسی کے لیے بددعا نہیں کی پھر مجھے کس کی بددعا لگ گئی تھی۔

اور وہ اسود علی جسے میرے کردار پر شبہ ہے، جسے میرے رویے سے بہت سی شکایات ہیں اب وہ مجھ سے شادی کر رہا ہے اور وہ کیا چاہتا ہے میں نہیں جانتی اور میں جانتی بھی کیا ہوں؟ میں جو سوچتی تھی میری زندگی میں اسفند عثمان نہیں رہے گا تو کچھ بھی نہیں رہے گا، تو اب کیا میں ختم ہو جاؤں گی اور کیا رابعہ کی ہر پیشین گوئی صحیح ثابت ہوتی رہے گی؟

نہیں میں اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گی۔ مجھے اس طرح ختم نہیں ہونا ہے، مجھے خود کو بچانا ہے۔ پچھلے

سترہ سال میں بنائی جانے والی شناخت کو یوں ختم نہیں ہونے دینا ہے مہرین منصور کو سرینڈر نہیں کرنا ہے، میں خوش رہوں گی اسفند کے بغیر، اسود کے ساتھ رہ کر میں گمنامی میں جاؤں گی۔ mental disorder کا شکار ہوں گی، میں کچھ نہیں چھوڑوں گی نہ تعلیم نہ زندگی پر اپنا حق۔ مجھے اپنی ذات کو ایک دفعہ پھر سے ڈھونڈنا ہے۔ میں مہرین منصور یوں ختم ہونے کے لیے پیدا نہیں ہوئی۔

............❁............

29-01-1990

کچھ دیر پہلے اسود علی میری ذات، میرے وجود کے پرخچے اڑا کر گیا ہے۔

''لوگ ٹھیک کہتے ہیں باہر سے خوبصورت وہی ہوتے ہیں جو اندر سے خوبصورت ہوں جیسے مشعل اور جو اندر سے خوبصورت نہ ہوں انھیں خدا ظاہری خوبصورتی بھی نہیں دیتا جیسے تم۔''

اس نے کہا تھا اور پچھلے سترہ سالوں میں جن پتھروں کو تراش کر جوڑ کر میں نے اپنا وجود بنایا تھا وہ یک دم گر پڑے تھے۔ بھیانک چہرہ اور کردار، ہاں شاید مجھے یہی القاب چاہیے تھے اور وہ جس چہرے کی پرستش کر رہا ہے وہ کتنا بھیانک تھا یہ شاید وہ کبھی جان نہیں پائے گا۔

مشعل کتنی خوبصورت تھی یہ سب جانتے ہیں مگر وہ کتنی بدصورت تھی یہ صرف میں جانتی ہوں۔ اور وہ جاننا نہیں چاہتا تھا کہ میں نے اس رات مشعل کو کیا کہا تھا مگر اسے پوچھنا چاہیے تھا وہ پوچھتا تو میں اسے بتا دیتی کہ میں نے اس رات مشعل کو کیا کہا تھا۔

یہ اسود تو نہیں تھا جو چند لمحے پہلے میرے سامنے تھا۔ یہ تو کوئی اور تھا، اسود کے لہجے میں اتنا زہر تو نہیں ہوتا تھا۔ وہ مشعل کی طرح بات کرنے کیوں لگا ہے؟ وہ جو مر گئی ہے وہ قابل رحم نہیں ہے، میں ہوں، پر سب مجھے مجرم سمجھ رہے ہیں جیسے مشعل نے خودکشی نہیں کی، میں نے اسے مارا ہے۔

''تم نے اسے کیا کہا ہے؟ تم نے اسے کیا کہا ہے؟''

ہر کوئی ایک ہی بات کہتا ہے اور میرا دل چاہتا ہے میں چیخ چیخ کر انھیں بتاؤں کہ وہ مجھ سے کچھ کہنے آئی تھی، میں نہیں اور اگر میں انھیں بتا دوں کہ وہ میرے ساتھ کیا کرتی رہی ہے تو کیا انھیں یقین آئے گا، کبھی بھی نہیں، مشعل کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی اور میں...... میں میرا کیا اعتبار وہ خوبصورت تھی مگر وہ سچ نہیں بولتی تھی اور اس نے مجھ سے بدلہ لیا تھا۔ مجھے اسفند سے محروم کر کے اس رات جب وہ میرے کمرے میں آئی تھی تو وہ یہی کہنے آئی تھی۔

''میں چاہتی ہوں تم اسفند سے کہو کہ وہ مجھ سے شادی کر لے۔''

میں اس کے مطالبے پر حیران رہ گئی تھی۔

''مجھے اسود سے کبھی بھی محبت نہیں رہی، میں صرف تمھیں تکلیف پہنچانے کے لیے اسے تم سے الگ کرتی رہی ہوں لیکن اسفند سے مجھے محبت ہے۔ چلو ایک ڈیل کر لیتے ہیں، تم اسفند کو مجھ سے شادی پر رضامند کرو۔ میں اسود کو یہ بتا دیتی ہوں کہ میں اس سے محبت نہیں کرتی صرف ایک مذاق تھا وہ......''

وہ بہت اطمینان سے میرے سامنے بیٹھ کر کہہ رہی تھی۔
''مشعل تم پاگل ہو چکی ہو، تمھیں پتا ہے تم کتنے لوگوں کی زندگی برباد کر رہی ہو، میری اسود کی، اسفند کی اور اپنی؟''
میں اس کی بات پر چلا اٹھی تھی۔
''تم تینوں کا تو مجھے پتا نہیں مگر میں اپنی زندگی برباد نہیں کر رہی ہوں۔ محبت مجھے صرف اسفند سے ہوئی تھی اور میں اسے حاصل کرنا چاہتی ہوں۔''
''اور تمہیں لگتا ہے میں اس میں تمہاری مدد کروں گی۔''
''تمھیں کرنی پڑے گی۔ کیا تم نہیں چاہتیں کہ تم اسود کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزارو اور یہ صرف میرے ہاتھ میں ہے۔''
''مشعل کیا کرو گی تم اسفند سے شادی کر کے۔ وہ تمھیں محبت نہیں دے گا خالی نام کیا کرو گی؟''
''تمھیں غلط فہمی ہے کہ وہ ساری عمر تمہاری محبت میں گرفتار رہے گا۔ تمھارے ساتھ اس نے محبت نہیں ایک افیئر چلایا تھا۔ مرد ایسے افیئر کرتے ہی رہتے ہیں۔ جب اسے میری جیسی بیوی ملے گی تو اسے تم بھول جاؤ گی پھر اسے مہرین نام کے ہجے بھی یاد نہیں رہیں گے۔'' اس کی بات مجھے گالی کی طرح لگی تھی۔
''اگر خود پر اتنا یقین ہے تو میری مدد کے لیے کیوں آئی ہو جاؤ اور خود اسفند کو فتح کرو جیسے تم نے اسود کو کیا تھا۔''
وہ چند لمحے تیز نظروں سے مجھے گھورتی رہی۔
''تمھیں ہم نے بچپن سے پالا ہے، بہت خرچ کیا ہے تم پر، بہت احسان کیے ہیں۔ اب احسان کرنے کی تمہاری باری ہے بلکہ یہ کہوں تو زیادہ بہتر ہے کہ اب نمک حلالی کرنے کا وقت آیا ہے۔ تم ثابت کرو کہ تم اپنے گھٹیا خاندان اور باپ کی کوئی گھٹیا صفات اپنے اندر نہیں رکھتی ہو۔''
میرا دل چاہا تھا میں اس کے منہ پر بہت زور سے تھپڑ ماروں مگر میں نے اسے تھپڑ نہیں مارا تھا۔ میں ہنسنے لگی تھی، بہت زیادہ، اتنا زیادہ کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔
''مجھے افسوس ہے مشعل کہ میں اپنے گھٹیا خاندان اور باپ کی ساری صفات اپنے اندر رکھتی ہوں۔ اب جبکہ میں یہ جان گئی ہوں کہ تم اسفند سے محبت کرتی ہو تو پھر یہ یقین رکھو کہ کبھی بھی تمہاری شادی اس سے نہیں ہوگی۔ اگر اسفند مجھے نہیں ملا تو وہ کبھی تمھیں بھی نہیں ملے گا۔
اور جہاں تک میرا اور اسود کا تعلق ہے تو ٹھیک ہے کچھ انتظار تو مجھے کرنا پڑے گا مگر بہرحال میں اسود کی محبت حاصل کرلوں گی۔ آفٹر آل کسی زمانے میں وہ میرا بیسٹ فرینڈ رہا ہے اور ویسے بھی تم نے خود ہی کہا ہے کہ مرد ایسے افیئر کرتے ہی رہتے ہیں۔ میں سمجھوں گی اسود نے بھی تم سے ایک افیئر چلایا تھا۔
بہت ترس آ رہا ہے مجھے تم پر۔ مجھے اسود مل جائے گا جو کسی زمانے میں مجھ سے بہت ہمدردی، بہت دوستی

رکھتا تھا اور اس کی یادداشت ٹھیک کرنے میں مجھے زیادہ وقت تو نہیں لگے گا اور اگر اسود نہیں ملتا تو اسفند تو مل ہی جائے گا جس سے میں محبت کرتی ہوں اور جو مجھ سے محبت کرتا ہے مگر تمھیں کیا ملے گا؟ اسود کو تم حاصل کرنا نہیں چاہتیں اور اسفند تمھیں ملے گا نہیں اور اس تک جانے کا واحد راستہ میں جانتی ہوں اور میں تمھیں وہاں سے گزرنے نہیں دوں گی۔ تم پچھلے چھ سال سے ہر جگہ مجھ سے ہارتی آ رہی ہو اب اور کہاں کہاں ہارو گی؟ مجھ سے مقابلہ کرنا چھوڑ دو یہ خوبصورتی کا ہتھیار ہر جگہ تمھارے کام نہیں آئے گا۔''

وہ میری باتوں پر بپھر گئی تھی۔

''میں تمھیں جیتنے نہیں دوں گی مہرین کبھی نہیں، تمہاری جگہ میرے قدموں میں ہے اور وہیں رہے گی۔ تم کیا جیتو گی اسود کو اور کیا پاؤ گی اسفند کو؟ میں تمھیں اس قابل رکھوں گی تو پھر نا، تم نے مجھے پاگل کہا ہے نا میں تمھیں بتاؤں گی پاگل کیا ہوتے ہیں۔ میں دیکھوں گی تم اب زندگی میں کیا پاتی ہو، کون سے جھنڈے گاڑتی ہو؟ مجھے تمھارے وجود، تمھارے چہرے، تمہاری آواز، تمہاری ذات سے نفرت ہے۔ تم اپنے باپ کی طرح گندی نالی میں گر کر مرنے کے لیے پیدا ہوئی ہو لیکن تمھیں زندہ رہنا چاہیے بہت دیر تک زندہ رہنا چاہیے میں تمھیں تمہاری زندگی میں ہی جہنم دکھا دوں گی میں تمھیں......''

''میرے کمرے سے نکل جاؤ ابھی اسی وقت۔''

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''یہ تمھارے باپ کا کمرہ نہیں ہے۔ یہ میرا گھر ہے میں جب تک چاہوں گی یہاں رہوں گی۔''

اس نے اپنے سامنے پڑی ہوئی تپائی کو ٹھوکر مار کر الٹا دیا۔ میرا دل چاہا تھا مگر میں ایسا نہیں کر سکتی تھی مجھے ایک عجیب سی وحشت ہو رہی تھی اگر یہ میرا گھر ہوتا تو میں اسے دھکے دے کر نکال دیتی مگر یہ میرا گھر نہیں تھا یہاں کچھ بھی میرا نہیں تھا۔

وہ کچھ دیر تیز تیز سانس لیتے ہوئے وہاں کھڑی رہی پھر میرے کمرے کا دروازہ ایک دھماکے سے بند کر کے چلی گئی تھی اور اس رات میں نے طے کیا تھا کہ ایک بار یہاں سے جانے کے بعد چاہے میرے ساتھ جو بھی ہو مجھے واپس یہاں نہیں آنا ہے۔ اسود دوسری شادی کرے تب بھی اور میرے ساتھ برا سلوک کرے تب بھی۔ مجھے کبھی ان لوگوں کے سامنے یہ ظاہر نہیں کرنا ہے مجھے ان کے سامنے یہی ظاہر کرنا ہے کہ میں خوش ہوں، بہت خوش ہوں اور مجھے مشعل کو یہی بتانا ہے کہ وہ اس طرح تو کبھی مجھے جھکا نہیں سکتی میں اسے اسود کے ساتھ خوش رہ کر دکھاؤں گی۔

اور اب اسود میرے ہاتھ میں لپٹا ہوا وہ سانپ لے گیا ہے اور اب مشعل بھی مر چکی ہے اور میں ایک بار پھر دوراہے پر کھڑی ہوں۔ ایک بار پھر مجھے خود کو بچانا ہے مجھے بچانے کے لیے میری مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا سوائے میرے۔

''اے خدا مجھے بچا لینا، مجھے محفوظ رکھنا، میری مدد کرنا۔ کوئی راستہ، کوئی راہ، مجھے دکھا کہ میں اس برزخ سے نکل جاؤں۔''

مجھ پر ہر دروازہ بند ہوتا جا رہا ہے اور مجھے لگ رہا ہے جیسے میں مر جاؤں گی۔ میں نے تو کبھی کسی کے لیے گڑھے نہیں کھودے۔ مشعل نے ٹھیک کہا تھا، اس نے واقعی میرے لیے زمین تنگ کر دی ہے اور اب میں کیا کروں گی؟ اسفند نے آج مجھ سے شادی سے انکار کر دیا ہے اور میں جو پچھلے ہفتے سے سوچ رہی تھی کہ شاید میں اس گرداب سے نکل جاؤں گی ایک بار پھر اس میں پھنس گئی ہوں اور اب مجھے رہائی کا کوئی راستہ باہر نظر نہیں آ رہا۔

''نہیں مہرین منصور اب میں تمہارے ہاتھ کا ہتھیار بننا نہیں چاہتا اگر تمہاری کزن کا خط مجھے نہ ملا ہوتا تو شاید میں ایک بار پھر تمہاری باتوں میں آ کر وہی حماقت کر بیٹھتا لیکن اب میں نہیں کروں گا۔ تم نے اپنے کزن کی زندگی برباد کر دی اسود اس سے محبت کرتا تھا لیکن تم نے اسود کو اس سے چھین لیا۔''

''اسفند، ایسا نہیں تھا میں......''

اس نے میری بات کاٹ دی تھی۔

''مہرین تم آج کچھ نہیں کہو گی صرف سنو گی مجھے تمہاری کسی بات پر اب کبھی یقین نہیں آئے گا۔ تمہاری کزن نے مجھے اسود کے وہ خط بھیجے ہیں۔ جن میں اسود اس سے اظہار محبت کر چکا ہے۔ تمہیں معلوم تھا کہ مشعل کی موت کے بعد اسود کبھی تم سے شادی نہیں کرے گا اس لیے اب تم چاہتی ہو کہ میں تم سے شادی کر لوں اور میں اتنا احمق ہوں کہ شاید کر بھی لیتا اگر تمہاری کزن کا خط مجھے نہ ملا ہوتا۔ مگر اب نہیں۔

تم نے مشعل کو مرنے پر مجبور کر دیا۔ مگر میں مشعل نہیں ہوں۔ تمہاری سزا یہ ہے کہ تم اسی طرح رہو، نہ تمہیں میں ملوں نہ اسود۔ بہت دھوکا کھایا میں نے تم سے۔ اگر میں تب مشعل کی بات سن لیتا جب وہ میرے پاس آ کر مجھے تمہارے اور اسود کے بارے میں بتایا کرتی تھی تو شاید میں اتنا بڑا دھوکا نہ کھاتا مگر تب میں اسے جھڑک دیتا تھا مگر وہ سچی تھی شاید اس لیے اسے اپنی جان گنوانی پڑی ہے۔ خدا حافظ۔

آج کے بعد تم کبھی مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہ کرنا۔''

میں بہت دیر تک ریسیور تھامے کھڑی رہی تھی تو اس رات جو خط مشعل نے پوسٹ کروائے تھے وہ اسفند کو کروائے تھے اور یہ خط اسے امریکہ سے واپس آنے کے بعد ملے تھے ورنہ شاید وہ دوبارہ کبھی میرے لیے پروپوزل بھیجتا ہی نہیں اور میں جو چند دن پہلے شیبا سے بات کرنے کے بعد مطمئن تھی کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور اس کی امی کی طرف سے پروپوزل لانے کے بعد سوچ رہی تھی کہ اب میری زندگی خوبصورت ہو جائے گی اب پھر وہیں تھی اور میرا دل چاہتا ہے میں بھی خودکشی کر لوں۔

مشعل نے مجھے ایک جلتے ہوئے برزخ میں ڈال دیا ہے اور میں کسی طور پر بھی اس کو سرد نہیں کر سکتی۔ ایک ایک کر کے میں سب کو گنوا چکی ہوں۔ لینا گردیزی، سارہ، اسود اور اب اسفند بھی۔ میں واقعی ایک تماشا بن گئی ہوں اور پتا نہیں میری کہانی ٹریجڈی ہے یا کامیڈی۔ شاید کامیڈی اور اگر مشعل زندہ ہوتی تو وہ مجھ پر قہقہے لگا کر ہنستی۔

''تو مہرین منصور لاؤ اب اپنے لفظ، اپنے حرف جن سے تم لوگوں کے دلوں کو جیتتی تھیں، جاؤ اب روسٹرم پر کھڑی ہو جاؤ اور میں دیکھتی ہوں کتنے لوگ تمہاری بات سنتے ہیں اور کتنے تم پر یقین کرتے ہیں۔ اب کوئی تمہاری بات

نہیں سنے گا یقین تو دور کی بات ہے اور تم سوچتی تھیں کہ تم نے مجھے ہرا دیا۔"

ہاں وہ مجھے یہی کہتی اور یہ ٹھیک تھا۔ میرا دل چاہتا ہے، میں کہیں بھاگ جاؤں میں جو لوگوں سے کہا کرتی تھی کہ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت کبھی نہیں پڑے گی اور اب...... اب وہ وقت ہے جب کوئی میری مدد کرنے کو تیار نہیں ہے۔ میرے لیے دنیا میں کیا ہے؟ امی مجھے اپنے گھر نہیں رکھ سکتیں۔ ددھیال والے بہت پہلے رشتہ توڑ چکے ہیں اور اب نانی اور ماموں بھی جان چھڑانا چاہتے ہیں۔

میں درخت کی سب سے اوپر والی شاخ پر چڑھ گئی تھی اور اب جب میں وہاں سے گری ہوں تو جس شاخ کو پکڑنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی ٹوٹ کر نیچے گر رہی ہے اور بہت عرصہ پہلے میں نے ایک مشاعرے کے لیے ایک نظم لکھی تھی تب میں نے اس نظم کی وجہ سے وہ مشاعرہ جیت لیا تھا لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب یہ نظم میری کہانی بن جائے گی:

People who are buried leave
Behind their memories.
People feel sad for them and worry,
But for the living man,
They are never sorry.
This person, who is the sufferer,
Will never be able to withstand,
The chances snatched from him.
He thinks, "Am I under a ban?"
So he dies, and the world is
Forever in debt
For the man who faced.
Death before his death.

............❁............

ڈائری کا آخری صفحہ خالی تھا۔ میں نے اسے بند کر دیا۔ میری آنکھوں میں چبھن ہو رہی تھی اور میں تھا بیسویں صدی کا سچا جسے گمان تھا کہ اس سے زیادہ سچ کوئی کیا بولتا ہوگا اور جسے یقین تھا کہ اس سے بڑھ کر چہرہ شناس کوئی ہو ہی نہیں سکتا اور آج میں منہ کے بل زمین پر گرا تھا اپنے سارے دعوؤں اور اندازوں کے ساتھ۔ سوچا کون تھا مشعل اکبر، معصوم خوبصورت جسے دیکھتے ہی اس کی بات پر یقین کر لینے کو جی چاہتا تھا...... اور میں...... اور بہت سے لوگ یہی کرتے تھے یا پھر مہرین منصور...... جس کے سامنے اب میں کیسے جاؤں گا میں نہیں جانتا اور میں تھا جو پچھلے کئی

سالوں سے جھوٹ کو وحی مان کر جی رہا تھا اور آئندہ کس پر اعتبار کر پاؤں گا یہ بھی نہیں جانتا۔
میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا بیگ میں سے وڈیو کیسٹس نکال کر میں باری باری وی سی پی میں لگانے لگا کوئی شبہ میرے ذہن میں باقی نہیں رہا تھا پھر بھی اپنے اندر کے چہرہ شناس اور حق پرست کو کچھ اور آئینہ دکھانا تھا۔
مختلف مختلف کی ویڈیوز تھیں۔ کسی میں وہ کمپیئرنگ کر رہی تھی، کسی میں کوئی مذاکرہ کنڈکٹ کروا رہی تھی۔ کہیں کوئی تقریری مقابلہ تھا اور کہیں کوئی مشاعرہ۔ کہیں وہ بہت سنجیدگی سے issues ڈسکس کرتے ہوئے اپنی opinion دے رہی تھی اور کہیں وہ پورے ہال کو اپنی باتوں سے کشت زعفران بنائے ہوئی تھی۔
وہ مہرین منصور جسے پچھلے تین سال سے میں نے اپنے گھر کے ملازم کی اہمیت بھی نہیں دی تھی۔ وہ بہت سوں کے لیے بہت اہم تھی اور وہ جو بات کرتے ہوئے بار بار مختلف ریفرنسز دے رہی تھی اب میرے گھر میں تھی اور اسے سامنے رکھی ہوئی چیزیں بھی ڈھونڈنا پڑتی تھیں۔
وہ مہرین منصور جو ہر جگہ بنا رکے بنا اٹکے بلا کی روانی سے بات کرتی تھی، بار بار اٹک جاتی تھی بار بار اسے لفظ ڈھونڈنا پڑتے تھے۔ میں کہتا تھا وہ خامیوں کا مرقع ہے، میں کہتا تھا اسے بولنا نہیں آتا، میں کہتا تھا یہ اس طرح دنیا کا مقابلہ کیسے کرے گی؟ پر وہ جب اسٹیج پر چلتی ہوئی روسٹرم پر آتی تھی تو ہال میں سکوت چھا جاتا تھا لیکن میں اسے کہتا تھا:
''تم بات نہ کرو، تم جھوٹی ہو، تم مکار ہو، تم اس قابل نہیں ہو کہ بات کر سکو۔''
میں نے ٹی وی بند کر دیا۔ کمرے میں ہر جانب فائلیں بکھری ہوئی تھیں۔ اخبارات میں چھپنے والے اس کے مختلف آرٹیکلز کی کٹنگز، مختلف سرٹیفکیٹس۔ مختلف اخبارات میں چھپنے والی اس کی تصویریں۔ مختلف لوگوں کی طرف سے آنے والے خط، کارڈز کا ایک ڈھیر۔ ہر فائل کو دیکھنے پر میں ایک نئے عذاب سے دوچار ہوتا جا رہا تھا اور اگر میں اس کی بات سن لیتا تو......
میں اب سچ جاننے کے لیے لاہور آیا تھا اور لاہور آنے کے بعد میں ننھیال گیا تھا میں ایک نظر مہرین کے کمرے کو دیکھ لینا چاہتا تھا وہاں رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ مہرین منصور کون ہے؟ میں نے نانی سے مہرین کے کمرے کی چابی مانگی تھی۔
''اس کے کمرے کی چابی تو اس کے پاس ہے وہ یہاں سے جانے سے پہلے کمرہ لاک کر کے چابی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔''
نانی امی نے مجھے بتایا تھا میں کچھ مایوس ہوا۔
''پھر میں کسی لاک میکر کو لے کر آتا ہوں۔''
میں انھیں بتا کر کمرے سے باہر آ گیا تھا اور آدھ گھنٹہ بعد جب میں لاک میکر کو لے کر گھر میں داخل ہوا تو میرا سامنا اشعر کی بیوی سنبل سے ہوا تھا۔ اشعر کی شادی مشعل کی موت کے ڈیڑھ سال بعد ہوئی تھی اور اس شادی پر مجھے اور امی کو نہیں بلایا گیا تھا سو سنبل سے میری پہلی ملاقات تھی۔
''میں لاک میکر کو لایا ہوں دروازہ کھلوانے کے لیے۔'' میں نے رسمی گفتگو کے بعد اسے بتایا تھا۔

''مہرین کے کمرے کا دروازہ کھلوانے کے لیے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

''ہاں......''

''آپ کو اس کی ضرورت نہیں پڑے گی میں ایک بار مشعل کا کمرہ صاف کر رہی تھی تو اس کی دراز میں سے کچھ چابیاں نکلی تھیں۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ کس چیز کی چابیاں ہیں کیونکہ وہ مشعل کی کسی دراز وغیرہ کی چابیاں نہیں تھیں۔ وہ چابیاں پھر گھر کے کسی اور دروازے یا الماری میں بھی نہیں لگیں پھر اتفاقاً مجھے خیال آیا تو میں نے انھیں مہرین کے کمرے پر ٹرائی کیا تو وہ اسی کے کمرے، الماری اور درازوں کی چابیاں تھیں۔''

میں سنبل کی بات پر حیران رہ گیا تھا شاید ممانی ہوتیں تو وہ یہ بات اسے کبھی بتانے نہ دیتیں مگر وہ اس دن گھر میں نہیں تھیں۔

پھر میں اوپر مہرین کے کمرے میں آ گیا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھولتے ہی میں رک گیا تھا۔ کمرے میں بے حد حبس تھا۔ ہر چیز پر گرد کی ایک موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔ کمرے میں جا بجا جالے لگے ہوئے تھے۔ میں دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر چلا گیا۔

مجھے یاد تھا شادی کی اگلی صبح میں اسے لے کر کراچی چلا گیا تھا اور پھر میں نے اسے دوبارہ واپس آنے نہیں دیا تھا۔ اس کی سب چیزیں وہیں تھیں۔ میں نے وہ چابیاں مختلف درازوں اور الماریوں میں لگانا شروع کی تھیں اور وہاں کوئی ایسا دراز نہیں تھا جس کی چابی اس کی رنگ کے اندر نہیں تھی۔ یعنی مشعل جب چاہتی وہاں آ سکتی تھی۔ اس کی جو چیز دیکھنا چاہتی تھی دیکھ سکتی تھی اور مہرین......وہ یہ بات کبھی بھی جانتی نہیں ہوگی۔

میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ میں دعائیں کرتا آیا تھا کہ جسے میں حقیقت سمجھتا رہا تھا وہی حقیقت رہے مگر اس بار میری کوئی دعا قبول نہیں ہوئی تھی۔ ان درازوں اور الماریوں سے نکلنے والی چیزیں میرا منہ چڑا رہی تھیں۔ میں ان سب چیزوں کو بیگز میں بند کر کے گھر لے آیا تھا اور اب ان پچھلے کئی سالوں کی ڈائریوں کو پڑھنے اور ان چیزوں کو دیکھنے کے بعد اب مجھے اس کا سامنا کرنا تھا، اس مہرین منصور کا جس کے سامنے میں بونا تھا۔

............❀............

05-06-1990

''کل رات اس نے میرے چہرے پر تھوک دیا۔ ایسا استقبال آج تک کسی اور دلہن کا نہیں ہوا ہوگا۔ مشعل نے ٹھیک کہا تھا میں واقعی اپنی زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔ اسود علی نے میرے سر سے دوپٹہ اتار کر پھینک دیا تھا۔ میرا دل چاہا تھا میں پھوٹ پھوٹ کر رووٴں اور پھر مشعل کا وہ خط......

اور پتا نہیں کیوں لیکن اب میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں مشعل کی باتوں پر اعتبار کر لوں، اس کے حرفوں کا یقین کروں یہ جو ساری دنیا اس کی ہمنوا ہے تو ضرور اس کی باتوں میں کچھ تو سچائی ہوگی ورنہ دنیا اس طرح اس کا ساتھ کیوں دے؟ اور اسود علی نے مجھے پھر اس لاش کے پاس پہنچا دیا ہے اور کل میں نے سرینڈر کر دیا ہے۔ میں اپنی زندگی بدل نہیں سکتی چاہے میں کچھ بھی کر لوں۔ وہ کیچڑ سے بھری ہوئی لاش میرا باپ ہی رہے گا اور میں نشہ کرنے والے کی بیٹی

ہی کہلاؤں گی۔

سترہ سال پہلے شروع کی جانے والی جدوجہد میں ختم کرتی ہوں۔ میں کبھی بھی زندگی کا یہ جوا نہیں جیت سکتی۔ میں دنیا کے لیے عیسیٰ بن جاؤں تب بھی وہ مجھے صلیب پر ضرور چڑھائے گی۔ میں جان گئی ہوں میں اس لاش سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتی۔

سترہ سال پہلے اسود نے ہی میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے وڈیو گیم کھیلنا سکھایا تھا اور میں نے سوچا کہ میں سب کچھ سیکھ سکتی ہوں۔ وہ تب ہاتھ نہ پکڑتا تو میں آج بہت خوش ہوتی اور اب سترہ سال کے بعد اس نے مجھے دھکا دے کر اسی کنوئیں میں پھینک دیا ہے۔ بہت غلط کیا تھا میں نے یہ شناخت کی لڑائی شروع کر کے۔ بے نشان رہنا زیادہ اچھا ہوتا ہے اور اگر میں ویسی ہی رہتی جیسی میں سترہ سال پہلے تھی، خوفزدہ، سہمی، احساس کمتری کا شکار، دوسروں سے مرعوب تو بہت اچھا ہوتا۔

میں سب کی خدمتیں کرتی زندگی گزارتی، کبھی کسی جگہ مقابلے کا خیال میرے دل میں نہ آتا، جب بڑی ہوتی تو کسی مڈل کلاس فیملی میں مجھے بیاہ دیا جاتا اور اس وقت میں دو تین بچوں کے ساتھ شعور کے عذاب کے بغیر بہت پرمسرت زندگی گزارتی۔ اس زندگی میں کوئی اسفند ہوتا نہ اسود نہ کوئی مشعل۔ اگر ہوتے بھی تو دیوی دیوتاؤں کے روپ میں جن کی پرستش میں مجھے کوئی عار نہ ہوتا مگر میں نے تو برابری کی ٹھان لی تھی اور اب منہ کے بل گرنے کے بعد مجھے پتا چلا ہے کہ میرے پاس تو اُڑنے کے لیے پَر بھی نہیں تھے مجھے اُڑنا کیسے آتا؟

میں سوچتی تھی میرے پاس خوبصورتی نہیں، دولت نہیں، اچھا خاندان نہیں تو پھر مشعل جیسے لوگوں کو ہرانے کے لیے میرے پاس کیا ہے؟ اور تب اچانک پتا چلا تھا کہ ذہن ہے اور تب میں نے سوچا تھا میں دنیا کو اس ذہن سے فتح کروں گی اور میں کرتی رہی مگر کب تک؟ یہ ہر جگہ کام نہیں آتا۔ اب اس کا جادو ختم ہو گیا ہے اور اب میرے پاس ایسا کچھ نہیں جس سے میں لوگوں کے دل جیت لوں۔ اب میرا سچ لوگوں کو جھوٹ لگنے لگا ہے اور اب مجھے زوال کا سامنا ہے اور اب میں ڈوب جاؤں گی۔ میرا دل چاہا تھا میں اسود سے کہوں، تمہاری یہ پابندیاں مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گی تکلیف تو صرف تمہاری زبان پہنچائے گی میں بہت گر گئی ہوں بہت زیادہ۔

وہ ٹھیک کہتا ہے ایک وقت ایسا آئے گا جب لوگ مجھ پر تھوکیں گے اور شاید میں خود بھی مہرین منصور پر تھوک دوں۔

..........❁..........

02-01-1992

آج امی کے مرنے کی اطلاع ملی ہے مجھے اور حسب توقع اسود علی نے مجھے جانے نہیں دیا۔ شاید وہ جانے دیتا تب بھی میں نہ جاتی۔ وہاں جا کر کرنا بھی کیا تھا مجھے؟ آٹھ سال کی عمر میں جب وہ مجھے چھوڑ کر دوسری شادی کر کے چلی گئی تھیں تو بہت دنوں تک میں انھیں ڈھونڈتی رہی تھی۔ نانی سے پوچھنے سے میں ڈرتی تھی۔ مجھے ڈر تھا وہ یہ پوچھنے پر کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔ وہ ان کی بیٹی تھیں اور میری تو صرف ماں تھیں اور پھر کئی دن بعد میں نے انھیں ایک

آدمی کے ساتھ میرے ہم عمر ایک بچے کی انگلی تھامے دیکھا تھا اور میں سمجھ گئی تھی میری جگہ کسی اور نے لے لی ہے۔ پھر ان کے اصرار کے باوجود میں ان کے پاس نہیں گئی تھی۔ میں باہر جا کر کھیلنے لگی تھی۔

پھر وہ کچھ ہفتوں بعد اپنے شوہر کے ساتھ باہر چلی گئی تھیں۔ پر ان کی طرف سے میرے لیے ہر ماہ کچھ رقم اور چیزیں ضرور آتی تھیں پھر چیزیں آنا بند ہو گئیں اور صرف چیک آتا رہا اور میرے کندھوں پر ہر ماہ آنے والی اس رقم کا بہت قرض تھا۔ اسی قرض نے مجھے اسفند کو ٹھکرا کر اسود کے لیے ہاں کرنے پر مجبور کیا تھا کیونکہ یہ امی کی خواہش تھی اور میں نمک حرام نہیں تھی۔ محبت وہ مجھ سے کرتی تھیں مگر ان کے گھر میں میرے لیے کبھی جگہ نہیں بن سکی تھی پر مجھے اس کی شکایت نہیں تھی میں ان کی مجبوری جانتی تھی۔

میرے اردگرد تو ہر فرد ہی مجبور تھا۔ اور پھر مشعل کے مرنے پر انھوں نے بھی میری طرفداری نہیں کی تھی۔ وہ بھی سب کے ساتھ مل کر مجھ سے یہی پوچھتی رہی تھیں کہ میں نے مشعل سے کیا کہا تھا؟ مجھے تب بھی ان سے کوئی شکوہ نہیں ہوا تھا۔ ان کے بھائی کے بہت احسان تھے ان پر، وہ احسان فراموشی کیسے کرتیں؟ پھر اسود سے میری شادی کے بعد انھوں نے بہت بار مجھے خط لکھے، فون کیے مگر میں ان کا ہر خط واپس بھجواتی رہی ان کی آواز سن کر فون بند کرتی رہی۔ میں دھوکا نہیں دے سکتی تھی اسود کو۔ عفی خالہ اس بات پر ناراض ہو جاتی تھیں مگر میں انھیں کیسے بتاتی کہ میرے کردار پر اتنے داغ پڑ چکے ہیں کہ اب اور کسی داغ کی جگہ ہی نہیں ہے۔

اور اب جب وہ ہمیشہ کے لیے چلی گئی ہیں تو مجھے ان سے صرف ایک شکوہ ہے۔ انھوں نے مجھے کیوں پیدا کیا؟ آخر میری زندگی کا مقصد کیا تھا؟ عفی خالہ نے جانے سے پہلے مجھے کہا تھا:

''مہرو تم میرے بیٹے کو بددعا نہ دینا، اللہ کے واسطے اسے کوئی بددعا نہ دینا۔'' اور میں نے ان سے کہا تھا:

''عفی خالہ میری تو دعا کسی کو نہیں لگتی بددعا کیا لگے گی؟''

اور یہ سچ تھا میں تو گناہ گار ہوں بہت سے لوگوں کی، مشعل کی، لینا گردیزی کی، سارہ کی، اسفند کی، اسود کی، ہر ایک کی، ضرور میں نے ہی کچھ غلط کیا ہوگا جو مجھے یہ سب بھگتنا پڑ رہا ہے۔

عفی خالہ چاہتی تھیں میں روؤں، بہت روؤں پر میں آنسو کہاں سے لاتی؟ رونا بھی تو ہر ایک کے مقدر میں نہیں ہوتا۔ پھر میرے پاس آنسو کہاں رہے ہیں اور فرق بھی کیا پڑے گا؟ پہلے بھی ہم لوگوں کے درمیان رابطہ کم تھا۔ ڈیڑھ سال سے وہ مکمل ختم ہو چکا ہے اور آئندہ آنے والے سالوں میں بھی اسود ایسا کوئی رابطہ ہونے نہیں دیتا یہ رشتہ تو میں ڈیڑھ سال پہلے ہی قبر میں دفن کر کے رو چکی ہوں اب اس پر کیا آنسو بہاؤں؟

❁

14-12-1992

عفی خالہ نے آج مجھے کہا تھا:

''تم بہت صبر والی ہو مہرین دیکھنا تمھیں اس کا کتنا اجر ملے گا۔''

''یہ صبر میری مجبوری ہے، مرضی نہیں اور ایسے صبر کا کوئی اجر نہیں ہوتا عفی خالہ۔''

میں نے ان سے کہا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ مجھے دیکھ کر رونے لگتی ہیں؟ وہ اپنے آپ کو میرا مجرم سمجھتی ہیں۔ حالانکہ مجرم تو میں ہوں ان کی، سب کی۔

''مجھے مشعل کہتی رہتی تھی پھوپھو مہرین اسود کو بہت پیار کرتی ہے بہت پسند کرتی ہے آپ خدا کے لیے مہرین کی شادی اسود سے کروادیں، وہ دونوں بہت خوش رہیں گے۔ پھر مجھے کیا پتا تھا کہ تمھیں اس طرح زندگی گزارنی پڑے گی۔''

میں کسی اچنبھے کے بغیر ان کی باتیں سنتی رہی تھی۔ مشعل کا بھی کیا قصور تھا۔ اس نے بھی کچھ سوچ کر ہی کہا ہوگا۔ اسے میری اتنی پروا رہتی تھی اور میں۔ میں پتا نہیں کیا ہوں کہ اسے مرنے پر مجبور کر دیا؟ پتا نہیں مشعل مجھے کبھی معاف کرے گی یا نہیں۔

میرا دل چاہتا ہے وہ ایک بار زندہ ہو جائے تو میں ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگوں۔ وہ اتنی خوبصورت اتنی معصوم تھی اور میں۔ پتا نہیں میں نے ایسا کیوں کیا؟

............❀............

01-04-1993

آج عفی خالہ بھی مر گئیں پھر کسی دن میں بھی مر جاؤں گی پھر اسود بھی۔ یہ پورا گھر خالی ہو جائے گا اور اسود سوچتا ہوگا کہ اسے میری بددعا لگی ہے جو وہ اپنی ماں کا چہرہ آخری بار نہیں دیکھ سکے گا۔ مگر ایسا تو نہیں تھا۔ میں بددعا نہیں دے سکتی۔ بددعا دینے سے کیا ہوگا؟

گزرا ہوا وقت واپس آ جائے گا؟ امی واپس آ جائیں گی؟ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا؟ نہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا تو پھر بددعا دینے کا فائدہ۔

پھر عفی خالہ سے تو میں بہت پیار کرتی تھی۔ ان کے ہونے سے مجھے تنہائی کا احساس نہیں ہوتا تھا پر آج کے بعد مجھے تنہائی کا عذاب بھی جھیلنا پڑے گا۔ مجھے اور عفی خالہ دونوں کو پتا تھا کہ اب وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہیں گی۔ ان کی آنکھوں میں زندگی کی چمک بہت دنوں سے ختم ہو گئی تھی۔ انھوں نے مجھ سے بھی بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بات کرتیں بھی تو ہر وقت معافی مانگتی رہتیں۔ انھیں لگتا تھا یہ سب ان کی وجہ سے ہوا ہے، نہ وہ مجھے شادی پر مجبور کرتیں نہ میرے ساتھ یہ ہوتا مگر میں انھیں کہتی رہتی تھی کہ یہ ان کی وجہ سے نہیں ہوا میرے گناہوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ اگر کوئی ذمہ دار تھا تو میں تھی پھر بھی وہ رونے لگتی تھیں اور جب رونا بند کرتیں تو گھنٹوں چپ لیٹی رہتیں۔

پتا نہیں اسود کو کیوں پتا نہیں چلا تھا کہ وہ آہستہ آہستہ مر رہی ہیں اور جب وہ دو ماہ کے لیے باہر جا رہا تھا تو میرا دل چاہا تھا میں اسے بتاؤں کہ اب شاید واپسی پر اسے عفی خالہ کی صورت نظر نہیں آئے گی مگر میں نے اسے نہیں بتایا۔ میں کون سی ولی تھی پھر عفی خالہ تو مجھے بہت پیار کرتی تھیں۔

آج گھر لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس وقت کچھ جاگ رہے ہوں گے کچھ سو رہے ہوں گے اور ہاسپٹل میں رکھی ہوئی عفی خالہ کو صبح دفن کر دیا جائے گا اور پتا نہیں اسود اس وقت امریکہ میں بیٹھا کیا سوچ رہا ہوگا شاید رو رہا ہوگا۔ پر

میں تو نہیں روئی تھی پھر اسے رونے کی کیا ضرورت ہے۔ بھلا رونے سے کیا ہوتا ہے پھر لوگوں کو تو مرنا ہی ہے، کیا ہم انھیں روک سکتے ہیں؟

............❁............

13-04-1993

کل اسود نے مجھ سے کہا کہ اس نے خالہ کی آخری خواہش کے احترام میں مجھے معاف کر دیا۔ پر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب معاف کرنے سے کیا ہوگا؟ اس نے تو معاف کر دیا پر کیا اللہ معاف کر دے گا؟ کیا لوگ معاف کر دیں گے؟ کیا مشعل معاف کر دے گی؟ کیا اسفند معاف کر دے گا؟ کیا لینا معاف کر دے گی؟ کیا سارہ معاف کر دے گی؟ کیا نانی معاف کر دیں گی؟ کیا مشعل کے گھر والے معاف کر دیں گے؟

ایک معافی سے کیا ہوتا ہے میں نے پتا نہیں کس کس کا دل دکھایا ہے، کس کس کو دھوکا دیا ہے، کس کس سے جھوٹ بولا ہے پھر ایک کے معاف کر دینے سے کیا ہوتا ہے؟

اسود نے کہا اب مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے، چاہوں تو جہاں مرضی جا سکتی ہوں۔ اب مجھے الگ کھانا پکانا نہیں پڑے گا، ہمیشہ سبزی اور دال نہیں کھانی پڑے گی۔ جو لباس چاہوں میں پہن سکتی ہوں۔ نئے زیور بھی پہن سکتی ہوں اور کارپٹ کی بجائے بیڈ پر سو سکتی ہوں، اور میں باہر لان میں، اور چھت پر بھی جا سکتی ہوں، پر میں یہ سب کیسے کروں گی اور ان سب کا فائدہ کیا ہوگا؟ مجھے تو دالوں اور سبزیوں کے علاوہ ہر چیز کا ذائقہ بھول چکا ہے پھر میں ان چیزوں کو کیسے کھاؤں گی اور نئے کپڑے اور زیور پہننے سے کیا ہوگا، انھیں پہن کر میں کیا کروں گی؟ جو کپڑے میں اب پہنتی ہوں یہ اچھے ہیں، مجھے ان سے پیار ہے پھر میں انھیں کیسے چھوڑ دوں اور بیڈ پر سونے سے کیا ہوگا مجھے بیڈ پر نیند کیسے آئے گی؟

اور مجھے کہاں جانا ہے، کس سے ملنا ہے؟ باہر کوئی بھی تو ایسا نہیں جو مجھ سے ملنا چاہتا ہو میری جیسی لڑکی سے کون ملنا چاہے گا جو بدصورت ہے، جھوٹی ہے اور ہر ایک کو دھوکا دیتی ہے اور پھر میں جہاں جاؤں گی لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ میں کتنی بری ہوں پھر ہو سکتا ہے وہ بھی مجھ پر تھوکنے لگیں یا مجھے پتھر ماریں۔

میں اب باہر جانا نہیں چاہتی ہاں مگر میں لان میں جانا چاہتی ہوں میرا دل چاہتا ہے میں وہاں جا کر گہرے گہرے سانس لوں، میں کھلی ہوا کو ہاتھ لگاؤں، میں پھولوں کو پیار کروں، میں پرندوں کو دیکھوں، میرا دل چاہتا ہے میں گھاس پر بھاگوں اتنا بھاگوں کہ میرے پاؤں تھک جائیں، مجھ سے سانس بھی نہ لیا جائے پھر میں گھاس پر گر جاؤں اور آنکھیں بند کر کے وہیں سو جاؤں پھر بارش ہونے لگے پر میں آنکھیں نہ کھولوں۔ ویسے ہی آنکھیں بند کیے چت لیٹی رہوں اور بارش کا پانی میرے چہرے کی ساری بدصورتی، ساری مکاری، ساری خباثت صاف کر دے پھر میرا تو چہرہ ہی ختم ہو جائے گا یہ تو بنا ہی جھوٹ اور فریب سے ہے پھر بارش کا پانی تو اسے گھلا دے گا پھر بھی میرا دل چاہتا ہے میں کھڑکی سے باہر نظر آنے والے آسمان کے نیچے چلی جاؤں وہاں سب کتنا خوبصورت......

............❁............

15-05-1993

پتا نہیں روپوں کو کیسے خرچ کرتے ہیں اور زیادہ روپوں کو کیسے خرچ کرتے ہیں؟ مجھے یاد نہیں آ رہا ہے بھول گیا ہے شاید۔ اب جب مشعل یا سارہ یا شیبا یا لینا یا رخشی یا لیلیٰ آئیں گی تو میں ان سے پوچھ لوں گی پر روپے بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔

صبح جب اسود نے مجھے روپے دیے تھے تو میں ڈر ہی گئی تھی، بھلا روپے مجھے کیا کرنے تھے؟ سب کچھ تو مل جاتا تھا۔ پھر اتنے سالوں بعد مجھے تو نوٹوں کی شکل بھی بھول گئی تھی۔ اس نے کہا تھا انھیں خرچ کر لینا۔ میں بہت دیر تک انھیں پکڑے سوچتی رہی تھی کہ خرچ کیسے کرنا چاہیے؟ پھر میں نے سوچا خرچ نہیں کرنا چاہیے رکھ لینے چاہئیں کبھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ پھر میں نے وہ گنے تو وہ بہت سارے تھے، میں نے انھیں الگ الگ کیا، ان کے حصے بنائے اب میں سوچتی ہوں کہ کچھ روپوں سے میں کتابیں لوں گی کچھ میں رخشی کے پاس رکھوا دوں گی، کچھ میں یونیورسٹی میں خرچ کرنے کے لیے رکھوں گی، کچھ میں بنک میں رکھوں گی، کچھ میں کسی کو دے دوں گی، کچھ میں اپنے پاس رکھوں گی، کچھ میں کپڑوں پر خرچ کروں گی، کچھ میں امی کو دے دوں گی۔ لیکن پتا نہیں میں جب کپڑے دھونے گئی تھی تو میں نے انھیں کہاں رکھ دیا تھا۔

ابھی میں نے انھیں ہر جگہ ڈھونڈا ہے مگر وہ مجھے ملے ہی نہیں۔ میں نے سوچا ہے کہ سارہ سے کہوں گی کہ وہ انھیں ڈھونڈ دے، اسے ہر چیز بڑی آسانی سے ملتی ہے۔ پھر مجھے لگتا ہے کہ شاید اسود نے انھیں لے لیا ہے۔ اسے نہیں لینا چاہیے تھا، وہ میرے روپے تھے، اسے میری چیز نہیں لینی چاہیے تھی۔ لیکن میں نے اس کے درازوں میں اس کے تکیے کے نیچے اس کے کپڑوں کی جیبوں میں تلاش کیا تھا۔ وہاں اور والے روپے تھے۔ لیکن میرے نہیں تھے شاید اس نے انھیں چھپا دیا ہے۔ لیکن ابھی جب سارہ آئے گی تو میں اس سے کہوں گی وہ مجھے ڈھونڈ دے گی۔ میری اکثر چیزیں وہی ڈھونڈتی ہے مجھے تو ملتی ہی نہیں ہیں۔

............❁............

27-05-1993

پتا نہیں میں مشعل جیسی خوبصورت کیوں نہیں ہوں؟ اتنے اچھے کپڑے پہنے ہیں میں نے اور زیور بھی مگر بہت بدصورت لگ رہی ہوں بلکہ زیور اور کپڑے پہن کر پہلے سے بھی زیادہ بری لگ رہی ہوں۔ میں نے مشعل سے کہا تھا کہ وہ مجھے تیار کرے پھر میں خوبصورت لگوں گی پر مشعل کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس نے یونیورسٹی جانا تھا۔ اس نے مجھے کہا ہے کہ اگلی بار وہ مجھے خود تیار کرے گی پھر میں خوبصورت ہو جاؤں گی مشعل کی طرح پھر سب لوگ مجھ سے بھی مشعل کی طرح محبت کریں گے۔

ابھی میں جب یونیورسٹی جاؤں گی تو میں مشعل کے پاس ہی جا کر بیٹھوں گی آخر وہ اتنی پیاری ہے حالانکہ سارہ مجھے کہتی ہے میں بہت پیاری ہوں پر مجھے یقین ہی نہیں آتا۔ وہ بھی میری طرح بہت جھوٹ بولتی ہے۔ ویسے وہ اچھی بھی بہت ہے میرے بہت کام آتی ہے، میں نے انھیں کہا ہے وہ میرے گھر آیا کریں۔ ہم مل کر پیپرز کی تیاری

کریں گے۔ ویسے میں نے انھیں کہا ہے کہ جب اسود آ جائے یا کوئی اور تو وہ سب چلی جایا کریں اسود پسند نہیں کرتا نا اس لیے۔ مگر اب میں کیا اسود کی وجہ سے اپنے دوستوں سے ملنا چھوڑ دوں؟ اب میں گھر سے باہر تو جاتی نہیں ہوں تو پھر میری دوستوں کو تو یہاں آنا ہی چاہیے نا ورنہ میں ان سے کہاں ملوں؟

میں نے اسفند سے کہا ہے کہ وہ مجھے کچھ بکس گفٹ کرے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے آیا تھا تو میں نے اسے کہا تھا کہ وہ جلدی مجھ سے ملنے آیا کرے، اتنی بار اس سے کہتی ہوں پھر وہ آتا ہے لیکن اسے بہت کام ہوتے ہیں، پھر مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں اس سے اتنا اصرار کروں۔ وہ سمجھے گا کہ پتا نہیں کیوں میں اسے بار بار بلا رہی ہوں حالانکہ میں تو بس اس سے اسٹڈیز کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔

وہ اچھے نوٹس بناتا ہے۔ میں بھی اچھے نوٹس بناتی ہوں مگر مجھے لگتا ہے کہ اس بار میں اس سے اچھے مارکس نہیں لے سکوں گی۔ اس کی تیاری بہت اچھی ہے۔ ایک اور بات بھی کہی تھی میں نے اسفند سے پتا نہیں یاد نہیں آ رہی، میں بہت سوچ رہی ہوں مگر وہ بات بھول گئی ہے جب مجھے یاد آئے گی تو میں ڈائری میں لکھ دوں گی۔

............❁............

20-06-1993

کل اسود مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اسے مجھ سے بہت محبت ہے۔ آج اسفند بھی یہی کہہ رہا تھا، مشعل بھی، سارہ بھی، شیبا بھی، لینا بھی، رخشی بھی، لیلیٰ بھی، سب کہتے ہیں کہ وہ مجھ سے بے حد محبت...... ابھی جب آج میں نے سب کو پارٹی میں بلایا تھا تو سب بہت خوش تھے۔ ہم نے گانے گائے۔ میں نے سب کے لیے اپنے ہاتھوں سے کھانا پکایا۔ سب بہت تعریف کر رہے تھے پھر اسود آ گیا۔ سب چپ ہو گئے، پریشان ہو گئے۔ اسود پسند نہیں کرتا کہ سب یہاں آئیں مگر اس نے انھیں کچھ نہیں کہا۔ مجھے برا لگا مگر پھر میں نے......

عفی خالہ آج اصرار کر رہی تھیں کہ میں زیور پہنوں، انھوں نے بار بار ضد کی پھر مشعل نے بھی ضد کی تو میں نے مشعل سے کہا کہ تم زیور پہن لو تو پھر اس نے پہن لیے وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ سارہ نے مجھے ایک گفٹ دیا تھا پر یاد نہیں کہ وہ کیا......

............❁............

06-1993

آج یونیورسٹی میں سب کہہ رہے تھے کہ میں بہت اچھی ہوں، تعریف کر رہے تھے پتا نہیں کس نے کہا تھا کہ میری آواز بہت اچھی ہے میں نے کہا تھا...... میرا دل نہیں چاہا آج کہیں جانے کو مجھے بخار تھا میں سارا دن سوتی رہی۔ دوپہر کو شیبا آ گئی تھی وہ مجھے اپنے گھر لے جانا چاہتی تھی میں نے کہا کہ آج میں مصروف ہوں، مجھے پڑھنا ہے ایگزام سر پر آ گئے ہیں پھر میں سارا دن پڑھتی رہی۔ میں روز پڑھتی ہوں۔ اب میں کہیں نہیں جاتی، پارٹی میں بھی نہیں۔ میرے ایگزام ہیں میں نے اسی لیے صبح سے پڑھنا شروع کیا تھا۔

شام کو اسود ایک ہوٹل میں کھانے پر لے گیا۔ وہاں مشعل بھی تھی وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی لیکن میں

زیادہ خوبصورت......

ابھی مجھے بہت کام کرنا ہے رات کا کھانا بنانا ہے، ابھی میں بہت مصروف......

............❀............

1993

ڈر لگ رہا...... تھا آج مجھے امی یاد آ رہی تھیں۔ انھوں نے کہا ہے وہ صبح آ...... اسفند کو میں نے آنے کو کہا تھا اس نے کہا تھا:

یونیورسٹی میں آج سب نے مجھ سے آٹو گراف لیے۔ میں نے اپنا نام لکھا اور...... ,Mansoor
Mehreen Mansoor, Mehreen Mansoor, Mehreen Mansoor, Mehreen Mansoor,
Mehreen Mansoor سارہ آج ناراض تھی پر مان گئی میں نے اسے...... صبح عظمیٰ خالہ بھی مجھ سے ناراض...... اسود مجھے کہہ رہا تھا اسے مجھ سے بہت محبت...... آج میں مشعل کے لیے ایک گفٹ خریدوں گی اسے...... ابو کو نشہ نہیں کرنا چاہیے میں نے انھیں کتنی بار......"

آخری بار ڈائری پر لکھی گئی تحریر پر تاریخ نہیں تھی اور جو آخری تاریخ ڈائری پر لکھی تھی وہ ڈیڑھ ماہ پہلے کی تھی اس کے بعد چند صفحات لکھے گئے تھے اور اس کے بعد کیا ہوا تھا کیا وہ ڈائری لکھنا بھول چکی تھی یا ڈائری ڈھونڈ نہیں سکی تھی؟

اس لفافے کے اندر صرف ایک ڈائری تھی اور اس ڈائری کے ختم ہونے کے بعد اس نے کاغذات کو اسٹیپلر کے ساتھ اسٹیپل کر کے چھوٹی چھوٹی ڈائریاں بنائی ہوئی تھیں۔ لاہور سے واپس آنے کے بعد میں نے اس کی اگلی ڈائری ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی اور مجھے زیادہ دقت نہیں ہوئی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کی ایک دراز میں وہ لفافہ مل گیا تھا جس میں ڈائریاں تھیں۔

وہ اس وقت سو رہی تھی۔ بہت دیر تک ڈائریاں ہاتھ میں لیے بیٹھے رہنے کے بعد پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا کہ میں مہرین منصور کا چہرہ دیکھوں۔ اس مہرین منصور کا جس سے میں واقف نہیں تھا اور جس کے سامنے ہم سب کیڑے تھے، میں، مشعل، خاندان کے سب لوگ۔

میں نے ٹیبل لیمپ بجھا کر کمرے کی لائٹ آن کی۔ بیڈ کے دوسری طرف جا کر میں پنجوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ سینے تک چادر اوڑھے سو رہی تھی۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ زرد رنگت اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں والا چہرہ۔ وہ چہرہ تو نہیں تھا جسے میں نے تصویروں اور وڈیوز میں دیکھا تھا۔ مجھے سات سال کی وہ بچی یاد آ گئی جسے میں اپنے ساتھ لیے پھرا کرتا تھا۔ تب میں صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ ہنسے، باتیں کرے، یوں چپ نہ رہے اور جب اس نے یہ دونوں باتیں سیکھ لیں تو میں نے بڑی بے رحمی سے انھیں چھین لیا تھا۔

بیرون ملک جانے تک وہ میری بیسٹ فرینڈ تھی۔ میں مانگے بغیر ہی اسے اپنی ہر چیز دے سکتا تھا اور دے دیتا تھا مجھے لگتا تھا کہ اگر میں مہرین سے دوستی نہیں رکھوں گا تو اور کون رکھے گا؟ امی مجھے اس کا خیال رکھنے کو کہتی تھیں وہ نہ بھی کہتیں

تب بھی پتا نہیں مجھے کیوں اس سے انس تھا۔

وہ مجھے اپنے اسکول کی باتیں بتایا کرتی تھی اور میں دلچسپی نہ ہوتے ہوئے بھی دلچسپی لینے کی کوشش کیا کرتا تھا میں اسے جوکس سنایا کرتا تھا اور وہ ہر جوک پر ہنستی تھی، اس جوک پر بھی جس پر کوئی اور نہیں ہنستا تھا۔ لیکن پتا نہیں باہر جانے کے بعد کیا ہوا تھا کہ ہماری دوستی ختم ہوگئی اور اب مجھے پتا چلا تھا کہ ہوا کیا تھا۔

مشعل کے پاس مہرین کے کمرے اور درازوں کی چابیاں تھیں وہ مہرین کی عدم موجودگی میں وہاں جاتی ہوگی۔ اس کی ڈائری پڑھتی ہوگی۔ مہرین میرے لیے کیا فیلنگز رکھتی ہے یہ اس نے وہیں سے جانا ہوگا اور پھر اس نے بڑی مہارت سے ہم دونوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ مہرین سے مجھ سے منسوب ایسی باتیں کہتی رہی تھی جو میں نے کبھی نہیں کہی تھیں اور مجھ سے مہرین کی ہمدرد بن کر اس کے بارے میں ایسی باتیں کہتی رہی تھی کہ میں مہرین سے برگشتہ ہوگیا تھا۔

ہر دفعہ میری اور مشعل کی باتوں میں مہرین کہاں سے آ جاتی تھی یہ بھی میں نے اب جانا تھا۔ یہ مشعل تھی جو کسی نہ کسی حوالے سے مہرین کا تذکرہ شروع کیا کرتی تھی۔ لیکن مشعل مہرین سے جیلس کیوں ہوگئی تھی شاید اس اہمیت کی وجہ سے جو یک دم مہرین کو ملنے لگی تھی، وہ مہرین جسے آج تک مشعل کے سامنے 2nd fiddle کی حیثیت حاصل تھی۔ یک دم ہی اس نے مشعل کو Somebody سے Nobody کر دیا تھا۔ پھر مہرین کی ڈائری پڑھ کر وہ جانتی رہتی تھی کہ مہرین اسے ہرانا چاہتی ہے، اسے نیچا دکھانا چاہتی ہے، اس سے آگے بڑھنا چاہتی ہے اور مہرین کی نفرت نے مشعل کو اور برہم کر دیا تھا۔

مجھے مشعل نے ایک ہتھیار کی طرح استعمال کیا لیکن جب اسے یہ پتا چلا کہ اب مہرین کی زندگی میں میری اہمیت نہیں رہی اب وہاں کوئی اسفند آ چکا ہے تو وہ مجھ سے جان چھڑانے کا سوچنے لگی۔ وہ میرے سامنے رو رو کر یہی ظاہر کرتی رہی کہ وہ میرے بغیر مر جائے گی اور میری امی زیادتی کر رہی ہیں لیکن در پردہ وہ میری امی کو بتاتی رہی کہ مہرین مجھے بہت پسند کرتی ہے اور مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔

میں بڑے آرام سے ایک احمق کی طرح اس کے ہاتھوں بے وقوف بنتا رہا اور مجھے کبھی اس کا احساس نہیں ہوا اور پھر مشعل نے اسفند کے پاس جا جا کر اسے مہرین سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ بے وقوف نہیں تھا اس لیے اس نے ان باتوں پر دھیان نہیں دیا اور پھر پتا نہیں کیسے مگر مشعل خود اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی اور اس رات شدید غصہ میں آ کر اس نے خودکشی کر لی شاید اس نے سوچا تھا کہ مجھے اور اسفند کو مہرین کے بارے میں خط لکھ کر وہ اس کی زندگی بھی برباد کر دے گی اور ایسا ہی ہوا تھا، مشعل کی قربانی بے کار نہیں گئی تھی۔ میں نے اور اسفند نے بالکل وہی کیا تھا جو اس نے سوچا تھا۔ کیوں مشعل اس سے اتنی نفرت کرنے لگی کہ وہ اپنی جان پر کھیل گئی صرف مہرین کو تباہ کرنے کے لیے۔

شاید تب تک حسد اور صدمے نے اسے بہت حد تک ذہنی طور پر ابنارمل کر دیا تھا۔ وہ شعوری اور لاشعوری طور پر خود کو مہرین کی جگہ سمجھنے لگی تھی۔ وہ جانتی تھی میں ملک سے باہر رہتا ہوں اس لیے کبھی بھی اس کی باتوں کی حقیقت

نہیں جان سکوں گا۔ اس لیے وہ مہرین کی ہر کامیابی پر اپنے نام کا ٹھپہ لگا کر میرے سامنے پیش کر دیتی تھی اور میں اس پر یقین کر لیتا تھا شاید ذہنی طور پر مشعل بھی مہرین سے متاثر تھی پر وہ یہ بات ماننے پر تیار نہیں تھی لیکن لاشعوری طور پر اس کے رویے مہرین کے طرح ہو گئے تھے۔

مہرین کی ڈائریوں میں بہت جگہ ایسے جملے لکھے تھے جو میں مشعل کے منہ سے سن چکا تھا اور اسے داد بھی دے چکا تھا پر اب مجھے پتا چلا ہے کہ مشعل کے پاس تو لفظ تک اپنے نہیں تھے وہ شاید میرے سامنے لاشعوری طور پر مہرین بن جاتی تھی۔ اس کی طرح باتیں کرتی تھی اس کی کامیابیوں کو اپنے نام سے پیش کرتی تھی اور مجھ سے ملنے والی داد اس کی انا کو تسکین پہنچاتی ہوگی کیونکہ میں واحد آدمی تھا جو اس کی ان خوبیوں، ان صلاحیتوں کی تعریف کرتا تھا جو اس میں تھیں ہی نہیں اور مشعل اپنی ساری خوبصورتی، ساری مکاری، ساری چالاکی کے ساتھ اس وقت اپنے ہاتھوں کھودی ہوئی قبر میں تھی، یہ سوچتے ہوئے کہ اس نے مہرین کو شکست دے دی ہے اور مہرین منصور اپنی عام صورت، اپنی ذہانت، اپنے سچ، اپنے حوصلے کے ساتھ ابھی بھی زمین کے اوپر تھی، زندہ تھی، یہ سوچتے ہوئے کہ وہ ہار چکی ہے اور میں تھا جو اپنی ساری ذہانت، صاف گوئی اور سچ کے ساتھ ایک جھوٹ کو پروان چڑھاتا رہا یہاں تک کہ یہ جھوٹ اتنا طاقتور بن گیا کہ اس نے سچ کو ہڑپ کر لینے کی کوشش کی مگر سچ پھر بھی جیت گیا تھا اور میرا کردار ایک preacher ایک reformer سے گھٹ کر صرف ایک تماشائی کا رہ گیا تھا۔

جنھیں سچ سے محبت ہوتی ہے اور جو سچے ہوتے ہیں وہ میرے اور مشعل کی طرح چلاتے نہیں پھرتے۔ خود کو اصول پرست، صاف گو، کھرے اور پتا نہیں کس کس لیبل کے ساتھ پیش نہیں کرتے، وہ مہرین کی طرح ہوتے ہیں جنھیں خود اپنی پہچان نہیں کروانی پڑتی نہ اپنا تعارف کروانا پڑتا ہے، لوگ جان جاتے ہیں کہ وہ کون ہیں اور جو نہیں جان پاتا وہ اسود علی ہوتا ہے خود ساختہ سچا اور self reformer جسے پھر اپنے کیے پر ساری عمر پچھتانا ہوتا ہے۔

اور یہ پچھتاوا تو اب ساری عمر میرے ساتھ رہے گا کیونکہ مہرین منصور کو ہمیشہ میرے سامنے رہنا تھا اور مجھے اس سے نظر بھی ملانی تھی بات بھی کرنی تھی اور یہ سب ساری عمر ہونا تھا اور میں اب کیسے اسے کبھی یہ کہہ پاؤں گا کہ مجھے سچ سے بے حد محبت ہے اور جھوٹ سے بے پناہ نفرت؟ وہ میری بات پر اتنا ہنسے گی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں گے۔

میں نے ایک بار پھر اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ میرا دل چاہا میں اس کے چہرے کو ہاتھ لگاؤں۔ بہت نرمی سے میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا مہرین، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمھارے لیے اس ملک کے سب سے بہترین سائیکاٹرسٹ کا انتظام کروں گا۔ میں تمھارے سب دوستوں کو واپس لاؤں گا۔ میں تمھیں وہ سب واپس دلاؤں گا جو تم نے خود حاصل کیا۔ اور پھر میں تم سے کہوں گا کہ تم مجھے معاف کر دو۔ اور مجھے وہ پرانا اسود علی بن جانے دو جس کی زندگی میں مشعل اکبر نہیں تھی اور جو لوگوں سے بدلہ نہیں لیا کرتا تھا۔''

میں نے اس سے سرگوشی کی تھی۔ یک دم اس کا چہرہ میری آنکھوں میں دھندلا گیا اور پتا نہیں کہاں سے پانی

آ گیا تھا۔

"تم جزا سزا کا اختیار اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش مت کرو۔ تمھیں کیا پتا کون گناہگار ہے کون بے گناہ؟ علم تو اللہ کے پاس ہے اور یہ اختیار بھی اس کے پاس رہنے دو۔ ایسا نہ ہو کہ تمھیں پچھتانا پڑے۔"

میرے کانوں میں بہت عرصے پہلے امی کی کہی ہوئی بات گونجی تھی۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے آنکھوں کی نمی کو ہاتھ سے صاف کرنے کی کوشش کی مگر پانی تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

# ہلالِ جرأت

میں نے اپنی آنکھوں کو مسلتے ہوئے ان میں اترنے والی نیند کو بھگانے کی کوشش کی..... پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے میں سو نہیں سکا تھا اور اگلے کتنے گھنٹے مجھے اسی طرح جاگتے رہنا تھا۔ مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا..... باہر گرتی ہوئی برف نے رات ہونے سے پہلے ہی ہر چیز کو مفلوج کر دیا تھا..... ہر چیز کو مفلوج؟

نیند نے واقعی میرے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا ہے..... یہاں کون سی چیز ہے جو مفلوج ہو سکتی ہے؟ مردہ پہاڑوں کی مردہ چوٹیاں.....؟ گہری کھائیاں.....؟ ٹنوں کے حساب سے پڑی ہوئی برف.....؟ صدیوں سے یہیں پڑے ہوئے چٹانوں کے یہ ٹکڑے..... یا آمنے سامنے اوپر نیچے چوٹیوں پر موجود ان چوکیوں اور بنکرز کے اندر حشرات کی طرح رینگنے والے میرے جیسے چند انسان؟

میں نے بسکٹ کے ڈبے میں موجود آخری سیلن زدہ بسکٹ کو پانی کے چند یخ قطروں کے ساتھ اپنے حلق کے اندر اتار لیا..... بنکر میں موجود خوراک کا ذخیرہ اب ختم ہو چکا تھا..... اڑتالیس گھنٹوں میں ہر دو گھنٹوں کے بعد میں نے چار بسکٹ اور پانی کے چھ گھونٹ پیئے تھے۔

چھیانوے بسکٹ اور پانی کے ایک سو چوالیس گھونٹ..... مجھے اپنے حساب کتاب پر ہنسی آ رہی تھی۔ زندگی میں پہلے کبھی ان دونوں چیزوں کو استعمال کرتے ہوئے گننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کوئی بھی نہیں کرتا..... اور اب یہاں بیٹھ کر یہ کام کر رہا ہوں تو شاید وقت بھی کاٹنا چاہ رہا ہوں۔

موسم ابھی تک ویسا ہی ہے جیسا پچھلے دو دن سے تھا..... تیز ہواؤں کے ساتھ برف باری ہو رہی ہے..... اور اس کا سلسلہ کب رکے گا یہ کوئی نہیں جانتا..... دو گھنٹے کے بعد میں کیا کھاؤں گا.....؟ پانی کا تو خیر کوئی مسئلہ نہیں..... برف لے کر پگھلائی جا سکتی ہے یا پھر ایسے ہی چوس لوں گا یا چوسنے کی کوشش کروں گا۔ اگر میری زبان کا درجہ حرارت برف کے درجہ حرارت سے زیادہ ہوا تو برف پگھل جائے گی..... (میری سینس آف ہیومر یہاں بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑ رہی۔)

بعض دفعہ یہاں کی سردی سے مجھے یوں ہی محسوس ہوتا ہے جیسے میرے جسم کا درجہ حرارت بھی اب مائنس

10 ڈگری سینٹی گریڈ رہنے لگا ہے...... (سینس آف ہیومر)......

اڑتالیس گھنٹے پہلے یہاں صرف بسکٹ اور پانی ہی نہیں اور بھی بہت کچھ تھا...... گوشت کے نمکین سوکھے ہوئے ٹکڑے...... خشک میوہ...... خشک بھنے ہوئے چنے...... اس وقت موسم خراب نہیں تھا ورنہ میں اس کی بھی راشن بندی کر لیتا...... اور انھیں اس طرح اکٹھا نہ کھاتا...... گوشت کے ٹکڑوں کا ذائقہ تو میں ابھی تک محسوس کر رہا ہوں، حالانکہ انھیں کھائے اڑتالیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔ پہلی دفعہ انھیں اس طرح کھانے کا اتفاق ہوا ورنہ میں انھیں پکا کر استعمال کرتا تھا...... اور انھیں چباتے رہنے سے مجھے دانتوں تلے پسینہ آ گیا اور پھر ان میں موجود نمک، میں نے پھر بھی انھیں کھا ہی لیا۔ وہ بالکل ربڑ کی طرح تھے...... چباتے جاؤ...... چباتے جاؤ...... مگر ٹوٹنا مشکل ہو جاتا ہے مگر جب تک وہ میرے منہ میں تھے، مجھے بڑی تقویت مل رہی تھی یوں جیسے خوراک کا ایک بڑا ذخیرہ میرے پاس تھا۔

فضا میں ایک بار پھر وہی آوازیں گونجنے لگی ہیں...... غصے کی ایک لہر سی جیسے میرے اندر اٹھی تھی...... ان کمینوں نے پھر شیلنگ شروع کر دی تھی میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی...... درد کی ایک ٹیس میرے ہاتھ میں اٹھی مگر میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

مشین گن میں کچھ دیر پہلے میں نے نیا راؤنڈ ڈالا تھا...... پچھلے دو گھنٹے میں، میں نے تین بار وقفے وقفے سے ان کی شیلنگ کے جواب میں فائرنگ کی ہے...... شیلنگ کے جواب میں فائرنگ......؟ شیلنگ کے جواب میں شیلنگ کرنے کے لیے میرے ساتھ کسی کا ہونا ضروری ہے اور میں یہاں اکیلا ہوں۔

اسلحہ بھی بڑی احتیاط سے استعمال کرنا پڑ رہا ہے۔ پتا نہیں اب کتنے راؤنڈز باقی رہ گئے ہیں...... بائیں ہاتھ میں اٹھنے والی ٹیسوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے بائیں بازو اور دائیں ہاتھ کی مدد سے باقی ماندہ راؤنڈ بھی فائر کر دیا۔ دوسری طرف اب خاموشی چھا گئی ہے۔

پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے یہی ہو رہا ہے۔ وہ فائر کرتے ہیں یا شیلنگ کرتے ہیں...... پھر میں فائر کرتا ہوں پھر وہ فائر بند کر دیتے ہیں۔ پھر میں فائر بند کر دیتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ شیلنگ یا فائرنگ کر کے دروازے پر دستک دیتے ہیں۔

''کوئی ہے؟ Knock Knock'' اور میں جواباً فائرنگ کرتے ہوئے کہتا ہوں۔

''ہاں ابھی میں ہوں۔'' وہ فائرنگ بند کر دیتے ہیں۔

''اچھا ٹھیک ہے پھر آئیں گے۔''

میں بھی فائرنگ بند کر دیتا ہوں۔ "Anytime"

میں مشین گن سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ ہاتھ میں اٹھنے والی ٹیسیں ایک بار پھر مجھے کراہنے پر مجبور کر رہی ہیں۔

دو دن پہلے اس ہاتھ پر گولی لگی تھی...... اس وقت جب میں باہر اپنے کچھ جوانوں کے ساتھ تھا...... مجھے دو گولیاں لگی تھیں ایک ماتھے سے رگڑ کھاتے اور میرا گوشت اڑاتے ہوئے گزر گئی۔ دوسری ابھی بھی میرے ہاتھ میں موجود ہے میں خوش قسمت تھا...... سات آدمیوں میں سے بچنے والا میں واحد آدمی تھا...... یا پھر بد قسمت تھا، سات آدمیوں میں سے شہادت کا رتبہ نہ پانے والا واحد آدمی تھا۔

واپس اندر آ کر میں نے اپنی مرہم پٹی کرنے کی کوشش کی۔ ماتھے سے نکلنے والا خون کچھ دیر کے بعد رک گیا تھا۔ وہ خطرناک نہیں تھا..... مگر ہاتھ میں موجود گولی..... تب مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ اگلے دو دن یہاں سے نیچے جانے کے بجائے مجھے یہیں گزارنے پڑیں گے۔

اب ہاتھ کی حالت دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ اسے کاٹنا پڑے گا مگر کتنا..... ابھی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ صرف ہاتھ ہی کاٹنا پڑے گا یا..... اور بھی کچھ.....

مجھے اپنی منگیتر زینب کا خیال آ رہا تھا..... اسے میرے ہاتھ بڑے پسند تھے۔

''ولید تمہارے ہاتھ تو مردانہ ہاتھ لگتے ہی نہیں اور فوجیوں کے ہاتھوں جیسے تو بالکل بھی نہیں..... اتنے نازک اور نفیس ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے میں بعض دفعہ ان پر کیوٹکس لگا کر دیکھوں کہ وہ کیسے لگتے ہیں۔'' وہ اکثر مذاق میں مجھے چھیڑتی تھی۔

اب اس وقت وہ اس ہاتھ کو دیکھ لے تو.....؟ میں سوچ رہا ہوں کٹوانے کے بعد یہ ہاتھ اسے بھجوا دوں..... بذریعہ کوریئر سروس..... شاید ایسی بات اس کے سامنے کہوں تو.....

''تمہارے پریکٹیکل جوکس کب ختم ہوں گے ولید.....؟ بڑے ہو جاؤ اب۔'' وہ یقیناً مجھ پر چلائے گی اگر روئی نہ تو..... (میرا سینس آف ہیومر۔)

میری کزن ہے وہ..... خالہ زاد کزن..... منگیتر بنے تو ابھی اسے صرف دو سال ہی ہوئے ہیں اور بیوہ بننے میں بس دو دن اور لگیں گے، اگر یہ برف باری اسی طرح جاری رہی اور نیچے بیس کیمپ سے کوئی نہ آیا تو..... یہاں ہزاروں فٹ کی بلندی پر کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات کس طرح گزارے گا..... جیسے میں اس وقت اندازہ نہیں کر پا رہا۔

مگر کوئی بات نہیں اگر وہ چھ آدمی برف کا کفن اوڑھ کر ہمیشہ کے لیے یہاں دفن ہو سکتے ہیں..... اگر سامنے اونچائی پر موجود چوکیوں میں بیٹھے ہوئے دشمن کے فوجی بھی اسی برف باری، اسی طوفان، اسی تنہائی اور ان ہی کھائیوں اور چوٹیوں کے ساتھ یہاں بیٹھے لڑ سکتے ہیں تو میں بھی لڑ سکتا ہوں..... اگر وہ مٹی کے لیے خون دے سکتے ہیں تو میں بھی دے سکتا ہوں.....

''آخری آدمی اور آخری گولی تک لڑیں گے۔''

مجھے پی ایم اے میں بار بار دہرایا ہوا سبق یاد آنے لگا..... میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آخری آدمی۔''

''آخری گولی۔'' آج پہلی بار ان دونوں چیزوں کی اہمیت اور صحیح مفہوم سمجھ میں آیا تھا..... میں نے مشین گن کے باقی راؤنڈز کو دیکھنا شروع کر دیا..... آخری آدمی، آخری گولیاں گن رہا تھا۔

اڑتالیس گھنٹے پہلے میں یہاں اس طرح اکیلا نہیں تھا، میرے چھ ساتھی میرے ساتھ تھے..... مگر اب میں یہاں اکیلا بیٹھا ہوں..... وہ چھ کے چھ باہر ہیں..... پتا نہیں، اتنی برف میں سے ان کی لاشیں نکل بھی سکیں گی یا

نہیں...... میں نے آنکھیں بند کر کے ایک بار پھر اس جگہ کے محل وقوع کو اپنے ذہن میں لانے کی کوشش کی جہاں ان کی لاشیں تھیں...... دو دن کی اس برف باری نے ہر چیز کو خاصا بدل دیا ہوگا...... پھر برف کی تہ در تہ...... میں نے مایوسی سے سر ہلایا...... شاید ان کی قسمت میں برف کی قبر ہی تھی...... اور شاید میری قسمت میں بھی۔

دو دن پہلے کیا ہوا تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آیا...... دو ساتھی باہر گئے تھے...... وہ بہت دیر کے بعد واپس آئے اور انھوں نے بتایا کہ انھوں نے چوکی سے باہر کچھ فاصلے پر نقل و حرکت دیکھی تھی۔ ہم لوگ یک دم چوکنے ہو گئے۔

پچھلے ماہ ہماری دو چوکیوں پر بھارتی فوجیوں نے حملہ کیا تھا۔ ایک چوکی پر انھوں نے قبضہ کر لیا اور ہم اسے واپس لینے میں ناکام رہے۔ دوسری چوکی والوں نے انھیں پسپا کر دیا...... اور اب یقیناً ہماری باری تھی۔

ہم نے اگلو (igloo) میں موجود ساتھیوں کو بھی بلوا لیا...... ایک ساتھی کو بنکر کے اندر چھوڑ کر ہم سب باہر نکل گئے۔ وہیں جہاں نقل و حرکت دیکھی گئی تھی۔ وہاں واقعی کچھ لوگ تھے اور وہ ہماری ہی طرف آ رہے تھے...... نہ صرف آ رہے تھے بلکہ ان میں سے کچھ خاصی اہم جگہوں پر پہنچ چکے تھے اور وہ اب یقیناً ہم پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ ہم جس حد تک لڑ سکتے تھے لڑے...... اندر بنکر میں موجود ساتھی بھی کچھ دیر بعد باہر ہمارے ساتھ آ گیا۔

ہم نے حملہ پسپا کر دیا مگر حملے میں میرے سارے ساتھی مارے گئے اور خود میں زخمی ہو گیا اور میں یہاں آ گیا۔ وائرلیس پر میں نے بیس کیمپ کو حملے اور ہونے والے جانی نقصان کی اطلاعات کوڈ ورڈز میں دی...... کیونکہ وائرلیس کی ٹرانسمیشن اکثر بھارتی فوجی درمیان میں سنتے رہتے تھے۔ میں نے انھیں کچھ اور لوگوں کو بھیجنے کے لیے کہا...... مگر پھر یک دم موسم خراب ہونا شروع ہو گیا...... اور مجھے بتایا گیا کہ ابھی کسی کو روانہ نہیں کیا جا سکتا۔

مجھے خطرہ تھا کہ بھارتی فوج کہیں دوبارہ حملہ نہ کر دیں...... اگرچہ پہلے حملے میں انھیں بھی خاصا جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا مگر دوسرا حملہ کرنے پر تو انھیں میدان صاف ملتا۔ کسی قسم کی کوئی مزاحمت درپیش نہ آتی۔ مگر انھوں نے دوبارہ حملہ نہیں کیا۔ میری چوکی پر وقفے وقفے سے شدید شیلنگ اور فائرنگ کی گئی...... شاید انھیں بھی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ہمیں خاصا جانی نقصان اٹھانا پڑا ہے...... اور وہ دیکھنا چاہ رہے تھے کہ ابھی چوکی میں کتنے لوگ موجود ہیں...... کوئی ہے بھی یا نہیں۔ جواباً شیلنگ نہ ہونے سے انھیں ہماری افرادی قوت کا تو پتا چل ہی گیا ہوگا مگر فائرنگ ہونے سے انھیں یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ ابھی مزاحمت ہو سکتی ہے۔

پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے میں وقفے وقفے سے فائرنگ کرتے ہوئے انھیں یہی بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ چوکی ابھی مکمل طور پر خالی نہیں ہوئی۔ ابھی وہاں کوئی نہ کوئی ہے...... اور وائرلیس پر بیس کیمپ سے رابطہ قائم کرتے ہوئے بھی میں آوازیں بدل بدل کر اپنے ساتھیوں کے نام استعمال کر رہا تھا تاکہ اگر ٹرانسمیشن کسی بھی طرح درمیان میں سن لی جائے تو وہ یہی سمجھیں کہ چوکی میں ابھی خاصے لوگ ہیں اور دوسرے حملے کا نہ سوچیں۔

ایک دوسرے پر فائرنگ اور شیلنگ کرتے ہوئے ہم پاگل لگتے ہیں...... نہ انھیں ہم نظر آتے ہیں نہ ہمیں وہ...... یہ سرحدی یا میدانی علاقہ تو نہیں کہ فوجی آمنے سامنے بیٹھے نظر آئیں...... بعض دفعہ تو یوں لگتا ہے جیسے فوجی اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے اس طرح اندھا دھند گولیوں کا استعمال کر رہے ہیں...... ہو سکتا ہے ان کی چوکی میں بھی اب

چند ہی لوگ موجود ہوں اور ان میں سے بھی کچھ میری طرح زخمی ہوں...... اور شاید ان کے فوری طور پر دوبارہ حملہ کرنے کی وجہ بھی یہی ہو۔ میرے قیافے اور اندازے جاری ہیں...... پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں یہاں اکیلا بیٹھا میں اور کر بھی کیا سکتا ہوں؟

دو دن پہلے سپلائی آنی تھی...... نہیں آ سکی...... اور مجھے ابھی یہاں آئے صرف چھ ہفتے ہی ہوئے ہیں...... چھ ہفتے میں ہی میں بہت کچھ سیکھ گیا ہوں...... آج سالگرہ بھی تھی میری...... چھ ستمبر کے دن ہوتی ہے میری سالگرہ...... پی ایم اے میں میرا مذاق اڑایا جاتا تھا۔

''تمہاری پیدائش ہی وطن کے دفاع کے لیے ہوئی ہے۔'' میرے ایک انسٹرکٹر نے ایک بار مجھ سے کہا تھا اور آج یہاں بیٹھا میں سوچ رہا ہوں کہ بعض باتیں کتنی سچی ہوتی ہیں۔

کچھ دیر پہلے میں نے اپنی سالگرہ کے دن سے ایک ہفتہ پہلے ملنے والے وہ سارے کارڈز اور خط دیکھے ہیں جو میرے گھر والوں اور زینب نے بھجوائے ہیں۔ میری بہن نے کارڈ میں لکھا تھا کہ وہ چاہتی ہے کہ میری عمر کم از کم دو سو سال ہو تا کہ میں اگلے دو سو سال اسے اس کی دوستوں کے گھر لے جاتا رہوں...... دو سو سال......؟

میرے چھوٹے بھائی نے مجھے کارڈ میں لکھا تھا کہ وہ میری واپسی کا بڑی شدت سے انتظار کر رہا ہے...... پچھلی دفعہ ایک اوور میں اس نے مجھے چودہ بار آؤٹ کیا تھا...... اس کا اصرار تھا کہ یہ ورلڈ ریکارڈ ہے۔ میرا کہنا تھا کہ یقیناً ورلڈ ریکارڈ ہے مگر ایک اوور میں چودہ بار آؤٹ کرنے کا نہیں بلکہ ایک اوور میں چونتیس نو بال کروانے کا...... تیرہ بار میں نو بال پر آؤٹ ہوا تھا...... صرف ایک بار صحیح بال پر اور وہ بھی اپنی غلطی کی وجہ سے ورنہ اس میں باؤلر کا کوئی کمال نہیں تھا۔ اس بار اس نے مجھے کارڈ کے ساتھ اپنے خط میں لکھا ہے کہ اس بار اس نے نئے اسپائکس خریدے ہیں اور وہ اس بار اپنے دس اوور کے سپیل میں ایک بھی نو بال نہیں دے گا۔

شاید اس بار یہاں سے واپسی پر اس کی ضرورت ہی نہ پڑے...... میں نے خون آلود دستانے میں لپٹے ہوئے اپنے سوجے ہوئے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

میری امی نے بھی مجھے اپنے خط میں بہت سی دعائیں بھیجی تھیں۔

''میرا دل آج کل بہت گھبرا رہا ہے...... ہر وقت تمہارا خیال آتا رہتا ہے۔ اپنا خیال رکھنا بیٹا۔''

انھوں نے تین صفحے کے خط میں پندرہ بار مجھے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی...... میری آنکھوں میں نمی اترنے لگی...... ان کا خط پڑھتے ہوئے میں اسی طرح آبدیدہ ہو جاتا تھا۔ ماؤں کو ہر بات کا پہلے سے پتا کیوں چل جاتا ہے؟

بابا کے خط میں ہمیشہ کی طرح نصیحتیں تھیں:

''تم کو یاد رکھنا چاہیے کہ تم ایک فوجی ہو...... فوجی کا کام اپنے کام میں excel کرنا ہوتا ہے...... ولید زماں میں چاہتا ہوں سیاچن سے واپسی پر تمھارے سینے پر کم از کم ایک میڈل ضرور ہو۔''

انھوں نے خط میں لکھا تھا...... کئی دن پہلے خط پڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ یہ بہت مشکل ہے۔ آخر

یہاں میں ایسا کر کیا سکتا تھا کہ ایک میڈل کا حق دار کہلاتا...... مگر اب میں سوچ رہا ہوں کہ اگر یہ چوکی بچ گئی...... اور کمک جلد پہنچ گئی تو ایک میڈل میرے سینے پر لگ ہی جائے گا...... نشانِ حیدر نہ سہی...... ہلالِ جرأت سہی۔

زینب کا کارڈ ہمیشہ کی طرح گلاب کے سرخ پھولوں سے بھرا ہوا تھا...... سرخ گلاب...... اس کی زندگی میں پھول نہ ہوں تو کچھ بھی نہیں ہوتا...... سویٹ پی اور سرخ گلاب...... وہ یکم ستمبر کو اسی سال پیدا ہوئی تھی جس سال میں پیدا ہوا تھا...... اور منگنی سے پہلے تک وہ شدید غصے میں آ جاتی تھی جب میں اسے سب لوگوں کے درمیان زینب آپا کہا کرتا تھا۔

"Behave yourself ولید! تمہیں شرم نہیں آتی مجھے آپا کہتے ہوئے۔" اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا، وہ غراتی۔

"اس میں شرم والی کیا بات ہے؟ میں تو آپ کا احترام کر رہا ہوں زینب آپا۔" میں بظاہر سنجیدگی سے کہتا۔

"تم اپنا احترام اپنے پاس رکھو...... پانچ دن کا فرق مجھے تمہاری آپا نہیں بنا دیتا...... سمجھے تم؟"

"بندے کو حساب کتاب میں صاف رہنا چاہیے۔ اب چاہے کوئی ایک دن بڑا ہو یا ایک منٹ...... بڑا تو بڑا ہی ہوتا ہے زینب آپا......" میں ڈھٹائی سے "آپا" پر زور دیتا۔

"تمہارا حساب اتنا اچھا ہوتا تو تم فوج میں نہ ہوتے انجینئرنگ یونیورسٹی میں بیٹھے ہوتے میرٹ لسٹ پر آ کر۔" وہ مجھ پر چوٹ کرتی۔

"آپا! وہ اور بات ہے۔" میں ایک بار پھر آپا پر زور دیتے ہوئے کہتا۔

"دفع ہو جاؤ تم۔ ولید! تم بہت ہی mean انسان ہو۔" وہ ہتھے سے اکھڑ جاتی۔

"اس بار میں کوئی لحاظ نہیں کروں گی کہ تم یہاں بیٹھے ہو...... ملازم سے کہہ کر دھکے دے کر نکلوا دوں گی تمہیں اگر اب مجھے آپا کہا تو۔" میں جانتا تھا، اس بار یہ دھمکی نہیں تھی، وہ تین بار اسی طرح مجھے گھر سے نکلوا چکی تھی...... میں نے اسے آپا کہنا چھوڑ دیا...... میں اسے باجی کہنے لگا۔

اس کے باوجود اس کے ساتھ میری دوستی ختم نہیں ہوئی...... ہم بچپن میں ہزاروں نہیں تو سینکڑوں بار ایک دوسرے کی ٹھکائی کر چکے تھے...... قریب گھر ہونے کا یہ نقصان تھا۔ میں اس کے بھائیوں کے ساتھ کھیلتا تھا اور میرا زیادہ وقت اس کے گھر پر ہی گزرتا تھا...... اس کے بھائیوں کے ساتھ میری بڑی دوستی تھی۔ زینب کے ساتھ بھی تھی مگر اس سے جھگڑا زیادہ ہوتا تھا۔

منگنی ہم دونوں کے کہنے پر ہی ہوئی تھی۔ اب اس میں محبت کے عنصر کا کتنا دخل تھا۔ پتا نہیں...... میں بہت دیر تک سرخ گلابوں والے اس میوزیکل کارڈ کو کھولے بیٹھا رہا......

"آخر تمہیں ہی کیوں بھیج رہے ہیں سیاچن...... اور بھی تو لوگ ہیں؟" یہاں پوسٹ ہونے سے پہلے اس کی بچکانہ بات سن کر مجھے بڑی ہنسی آئی تھی۔

"میں ان سے کہہ دیتا ہوں میرے بجائے زینب جواد کو سیاچن بھجوا دیں۔ ٹھیک ہے؟" وہ میری بات پر

ہنسنے کے بجائے رونے لگی۔

''تم سے کتنا کہا تھا ایف ایس سی کے دوران کہ محنت کرو...... پڑھو، نمبر لے لو...... تاکہ انجینئرنگ یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہو جائے مگر تم نے......'' وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ مجھے اس کی بات پر اور ہنسی آئی۔

ہاتھ میں یک دم پھر ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

............❀............

چھ ستمبر کے سلسلے میں ریڈیو پاکستان کی طرف سے منعقد کیے جانے والے شو کی تیاریاں اپنے پورے عروج پر تھیں۔ اس شو کو براہِ راست براڈ کاسٹ کیا جانا تھا اور مہمانوں میں جہاں فوج میں مختلف خدمات سرانجام دینے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، وہاں سنگرز بھی تھے۔

ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جو مختلف جنگوں میں دادِ شجاعت دینے والے ہیروز کی وجہ سے کم اور نوجوان نسل کے نمائندہ گلوکاروں کو سننے کے لیے زیادہ جمع تھے۔

سب لوگ اپنی سیٹوں پر براجمان ہو چکے تھے۔

کمپیئر ایک بار پھر اسٹیج پر چڑھ کر اپنی لائنز کی ریہرسل کر رہا تھا۔ ہال میں مکمل خاموشی تھی۔ گونجنے والی واحد آواز کمپیئر کی تھی جو چھ ستمبر کے حوالے سے اپنی لائنز کو بڑے پر اعتماد انداز میں دہرا رہا تھا...... اس کی ساتھی کمپیئر مسکراتے ہوئے حاضرین کو دیکھ رہی تھی۔

............❀............

صوبیدار (ریٹائرڈ) کریم بخش نے آٹھویں رو کی دسویں نشست پر بیٹھے ہوئے ایک بار سر اٹھا کر اسٹیج پر موجود روشنیوں کو دیکھا...... اور اسے اپنا گلا خشک ہوتا ہوا محسوس ہوا...... زندگی میں پہلی بار وہ اس طرح کے کسی شو میں شرکت کر رہا تھا اور وہ گھبراہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ اس کی گھبراہٹ یہ سوچ کر اور بڑھتی جا رہی تھی کہ کچھ دیر کے بعد وہ خود اس اسٹیج پر موجود ہوگا اور اسی کمپیئر سے بات کر رہا ہوگا۔ جو اس وقت بڑے فراٹے کے ساتھ رٹے رٹائے جملے ادا کر رہا تھا۔

کریم بخش نے اپنے سر پر موجود قراقلی ٹوپی کو ہاتھ سے درست کیا اور پہنی ہوئی واسکٹ پر لگے ہوئے ایک اکلوتے تمغے پر فخریہ نظر ڈالی۔

وہ زندگی میں ان تمام مواقع کو انگلیوں پر گن سکتا تھا جب اس نے یہ قراقلی ٹوپی اور واسکٹ پہنی تھی...... پہلا موقع وہ تھا جب اس نے اس میڈل کو وصول کرنے کے بعد صدر کی طرف سے دیے جانے والے ایک عشائیے میں شرکت کی تھی...... دوسرا موقع وہ تھا جب اس کے بیٹے کی شادی ہوئی تھی اور تیسرا موقع آج آیا تھا...... واسکٹ اور قراقلی ٹوپی میں سے اب بھی تمباکو کی بو آ رہی تھی جو ان کپڑوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اس صندوق میں رکھا ہوا تھا جس میں یہ کپڑے رکھے تھے۔

ایک گہرا سانس لے کر اس نے اس گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی جس کا وہ شکار ہو رہا تھا...... سر اٹھا کر

اس نے اسٹیج پر لگی ہوئی ان دس تصویروں پر نظر دوڑائی جنھیں نشانِ حیدر مل چکا تھا...... پھر اس کی نظر اس کونے میں گئی جہاں تینوں افواج کے جھنڈے موجود تھے، اس نے اگلی نظر اپنے اردگرد موجود لوگوں پر ڈالی۔ وہ سب اسی کی طرح کے چھوٹے رینک کے فوجی تھے جنھیں مختلف جھڑپوں میں مختلف امتیازی کارناموں پر میڈلز دیے جا چکے تھے اور وہ سب اس کی طرح گھبراہٹ کا شکار تھے۔ وہ ان میں سے کچھ کو ذاتی طور پر جانتا تھا...... کئی سال پہلے ان میں سے کچھ اسی کی یونٹ کا حصہ تھے اور کئی کے ساتھ اس نے مختلف قسم کی مشقوں میں حصہ لیا تھا اور کئی کے بارے میں اس نے مختلف حوالوں سے مختلف لوگوں سے سنا تھا...... مگر آج پہلی بار انھیں دیکھ رہا تھا اور آج پہلی بار ایک چھت کے نیچے ان سے مل رہا تھا۔

مگر اس کے باوجود اس کی گھبراہٹ ان لوگوں کی مرہونِ منت نہیں تھی...... یہ ان لوگوں کے چہرے کے تاثرات اور جسم کی حرکات نہیں تھیں جو اس کے لیے گھبراہٹ یا پریشانی کا باعث بن رہی تھیں...... بلکہ وہاں ان کے ساتھ بیٹھے اسے کچھ حوصلہ محسوس ہو رہا تھا...... شاید وہ لوگ وہاں نہ ہوتے تو وہ اس ہال سے بھاگ ہی جاتا۔ اس نے ایک بار پھر ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے اسٹیج کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی نظریں روشنیوں سے چکاچوند ہو گئیں۔

ہال میں اب پروگرام کا باقاعدہ آغاز ہونے والا تھا...... فائنل کیو دی جا رہی تھی۔ کریم بخش نے ایک گہرا سانس لے کر ایک بار پھر سر اٹھایا۔

............❁............

میں نے پاس پڑے ریڈیو کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وائرلیس کے علاوہ بیرونی دنیا سے ہمارے رابطے کا یہ واحد ذریعہ تھا۔ بعض دفعہ کوئی اسٹیشن ٹیون اِن کرتے ہوئے دوسری طرف کے فوجیوں کی فریکوئنسی مل جاتی۔ بعض دفعہ ان کی گفتگو عام ہوتی...... بعض دفعہ وہ بھی کوڈ ورڈز میں بات کر رہے ہوتے...... اور یہاں چوکی میں بیٹھے ہوئے لوگ ان کوڈ ورڈز کو حل کرنے کی کوشش کرتے رہتے...... یہ جیسے ہمارے لیے تفریح کا ایک ذریعہ بن جاتا تھا۔

میں جانتا تھا آج چھ ستمبر کی مناسبت سے ریڈیو پر بہت سے پروگرامز اور گیت نشر ہو رہے ہوں گے۔ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں میں بار بار ریڈیو آن آف کرتا رہا تھا...... کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا اس کی بیٹریز ڈاؤن ہو جائیں اور میں ان واحد انسانی آوازوں سے بھی محروم ہو جاؤں...... جنھوں نے اس تنہائی اور تکلیف میں بھی مجھے اپنے ہوش و حواس میں رکھا ہوا تھا۔

''خواتین و حضرات! میں آپ کو ریڈیو پاکستان کی طرف سے خوش آمدید کہتا ہوں۔ آج کی خاص تقریب پاک فوج کے ان جوانوں کے کارناموں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے منعقد کی جا رہی ہے جو سرزمین پاک کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے پر یقین رکھتے ہیں۔'' بے مقصد ٹیوننگ کرتے ہوئے ایک اسٹیشن سے آنے والی صاف آواز اور الفاظ نے مجھے روک لیا۔

''یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آج کو ہمارے کل کے لیے قربان کر دیتے ہیں۔'' میرے چہرے پر ایک مسکراہٹ ابھری۔ ہاتھ میں ابھرنے والی ٹیسیں یک دم کچھ مدھم ہونے لگیں۔

''یہ قوم سے کہتے ہیں کہ تم سو جاؤ کیونکہ بارڈرز پر ہم ہیں۔''

میں نے ایک بار پھر باہر جھانک کر دیکھا۔ برف باری ابھی نہیں تھمی تھی اور میرے لیے اگر یہ برف باری پریشانی کا باعث تھی تو دوسری طرف ایک حفاظتی دیوار کا کام بھی کر رہی تھی۔

میں جانتا تھا، بھارتی فوجی برف باری اور تاریکی میں میری چوکی پر حملہ کرنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ اگر وہ ایسی کوشش کرتے تو برف اور کھائیاں انھیں مجھ تک پہنچنے نہ دیتیں۔

''اور اگر کوئی دشمن ہماری مٹی کی طرف بڑھنے کی جرأت کرے گا تو ہم لڑیں گے اس وقت تک جب تک کہ ہماری رگوں میں خون کا آخری قطرہ موجود ہے..... اس وقت تک جب تک ہمارے وجود میں زندگی کی آخری رمق موجود ہے۔''

کمپیئر ایک بار پھر کہہ رہا تھا..... اس بار اس کی آواز ہال میں ابھرنے والی تالیوں کے شور میں بری طرح دب گئی تھی۔ لوگ یقیناً اس کے جملوں سے محظوظ ہوئے تھے..... تالیوں کا شور ابھی تک سنائی دے رہا تھا..... کمپیئر اب خاموش ہو کر تالیوں کے تھمنے کا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے اپنی رائفل کو ایک بار پھر نئے سرے سے لوڈ کیا۔ اگرچہ اس وقت میں اسے استعمال نہیں کر پا رہا تھا اور شاید اس مقابلے میں اس کی ضرورت ہی نہ پڑتی کیونکہ وہ لوگ اگر اس چوکی تک پہنچ جاتے اور انھیں رستے میں کہیں نہ روکا جاتا تو وہ اس چوکی کو مجھ سمیت اڑا دیتے..... مگر میں نے پھر بھی ایک بار رائفل کو نئے سرے سے لوڈ کیا۔

''زندہ قومیں اپنے غازیوں اور شہیدوں کو فراموش نہیں کرتیں..... زندہ قومیں اپنے غازیوں اور شہیدوں کے خون کے ان قطروں کا احترام کرتی ہیں جو وہ اس مٹی کے دفاع کے لیے بہاتے ہیں..... اور آج اس ہال میں ہم آپ کو ایسے ہی کچھ لوگوں سے ملوائیں گے جن کی قوم احسان مند ہے۔''

میں نے اپنی ٹانگیں سکیڑ لیں جسم کو تھوڑا سا سکون ملا..... میں ایک بار پھر گود میں رکھے ہوئے اس ریڈیو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ برف باری کے باوجود حیرت انگیز طور پر آواز بہت صاف تھی..... مگر یہاں اکثر ایسے عجیب واقعات ہوتے رہتے ہیں۔

''میں سب سے پہلے اپنے پہلے مہمان کو بلواتا ہوں جن کا تعلق پاکستان ایئر فورس سے ہے..... 1965ء کی جنگ میں انھیں دشمن کے دو جہاز مار گرانے کا اعزاز حاصل ہوا۔ میں دعوت دیتا ہوں۔''

میری توجہ اچانک باہر مرکوز ہو گئی۔ مجھے محسوس ہوا تھا، برف باری رک گئی تھی..... میری حسیات یک دم جیسے بیدار ہو گئی تھیں۔ میں اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے دائیں ہاتھ سے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے کھڑا ہو گیا..... اگر برف باری واقعی رک گئی تھی تو ایک بار باہر کا جائزہ لینا ضروری ہو گیا تھا۔

مجھے موسم کا اندازہ لگانا تھا۔ کیا اس وقت ہیلی کاپٹر کی کوئی فلائٹ ممکن تھی..... اگر برف باری اگلے کئی گھنٹے رکی رہی تو دشمن کا دوسرا حملہ بھی ہو سکتا تھا۔

ان کی حکمت عملی کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا تھا مگر یہ ضرور اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ اس چوکی کو حاصل

کرنے کے لیے بے خوف تھے...... یہ اندازہ تو انھیں ہو ہی چکا ہوگا کہ پہلے حملے میں ہمارا جانی نقصان ہوا ہے کیونکہ انھوں نے ہمارے جوانوں کی لاشیں دیکھ لی ہوں گی اور وہ فوجی جو پسپا ہونے کے بعد واپس چلے گئے تھے انھوں نے یقیناً اس بات کی خبر آگے دی ہوگی...... اب چوکی میں کتنے آدمی موجود ہیں...... اس کا انھیں حتمی اندازہ نہیں ہوگا...... لیکن اگر وہ ہماری لاشیں گن گئے تھے تو وہ جانتے ہوں گے کہ اب چوکی میں دو چار سے زیادہ لوگ نہیں ہوں گے۔

اگرچہ میں نے وائرلیس پر بار بار گفتگو کے درمیان دو تین مختلف آوازوں اور لہجوں میں بات کی...... مگر گفتگو درمیان میں سننے والے لوگ کتنے بے وقوف یا کتنے ہوشیار تھے، اس کا اندازہ میں نہیں کر سکتا تھا...... یہ بات یقیناً وہ بھی جانتے ہوں گے کہ چوکی پر ابھی تک کوئی کمک نہیں پہنچی کیونکہ موسم نے ایسی کسی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا...... اور اب برف باری رک جانے پر وہ اندھیرے میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر دوسرے حملے کا بھی سوچ سکتے تھے۔ ایک بار باہر جانا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے اپنے ہوش و حواس کو بحال رکھنے کی کوشش کی اور لڑکھڑاتے قدموں سے آہستہ آہستہ باہر نکل گیا...... سردی کی ایک لہر نے مجھے یخ کر دیا تھا۔ اندر اور باہر کے درجہ حرارت میں اس وقت زمین آسمان کا فرق تھا...... میرے دانت بجنے لگے تھے، میں نے اپنے چہرے کے ٹوپی سے باہر رہ جانے والے تھوڑے سے حصے کو ہاتھ سے ڈھک لیا۔ وہاں قبر جیسی تاریکی اور ٹھنڈک تھی اور آسمان سے گرنے والی برف اب واقعی مکمل طور پر بند ہو چکی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھکڑ بھی آہستہ آہستہ دم توڑ رہے تھے۔

میں واپس اندر پلٹ آیا...... کچھ دیر بے دم سا بیٹھا میں وہاں ریڈیو پر گونجنے والی آواز کو بے مقصد سنتا رہا۔ پھر میں اٹھ کر وائرلیس کے پاس چلا گیا۔ ریڈیو کو وقتی طور پر میں نے بند کر دیا تھا...... وائرلیس کی فریکوئنسی ایڈجسٹ کرتے ہوئے میں نے ایک بار پھر بیس کیمپ سے رابطہ قائم کیا۔ موسم کے ٹھیک ہونے کی خبر ان تک بھی پہنچ چکی تھی اور ایک بڑا رسک لیتے ہوئے وہ دس لوگوں کی ایک ٹیم کو رات کے اسی وقت وہاں پہنچانے کی تیاریاں کر چکے تھے۔

میں جانتا تھا، وہ دس کے دس لوگ اس وقت اس مہم پر روانہ ہوتے ہوئے اپنی جان کو داؤ پر لگائیں گے...... مگر اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا...... جلد یا بدیر کسی ٹیم کو یہاں آنا ہی تھا...... اور بہتر تھا یہ ٹیم اسی وقت یہاں آ جاتی...... ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میں نڈھال ہو رہا تھا اور میں نہیں جانتا تھا کہ میں کس وقت اپنے ہوش و حواس کھو دوں گا...... اس وقت سے پہلے کسی کو یہاں ہونا چاہیے تھا ورنہ یہ چوکی بھی...... میں پھر اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا مگر اس بار میں قدرے مطمئن تھا...... چند گھنٹوں کی بات تھی پھر ٹیم یہاں پہنچ جاتی...... دس لوگ نہ سہی...... ان میں سے دو چار تو یہاں پہنچ ہی جائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ دس کے دس ہی یہاں پہنچ جائیں...... اگر وہ بہت خوش قسمت ہوئے تو۔

میں ایک بار پھر مشین گن سے باہر فائر کرنے لگا...... یہ ضروری تھا دوسری طرف سے جواب فوراً آیا...... اس بار میں نے قدرے زیادہ دیر تک فائرنگ کی...... میرے پاس وہاں ایمونیشن کی کمی نہیں تھی...... دوسرے راؤنڈ کو فائر کرنے کے بعد میں نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی اور گہرے سانس لینے لگا۔

دوسری طرف ابھی بھی فائرنگ ہو رہی تھی مگر میرا اب اس فائرنگ کے جواب میں فائرنگ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا...... میں جانتا تھا، کچھ دیر بعد وہ بھی تھک ہار کر بیٹھ جائیں گے۔ ایک بار پھر میں نے ریڈیو

آن کر دیا۔

..........❁..........

"اب ہم آپ کی ملاقات کرواتے ہیں سیاچن کے ایک ہیرو سے۔" میں کچھ چونک گیا۔ اپنی سماعتوں کو میں نے ریڈیو پر مرکوز کر لیا۔

"1984ء میں سیاچن پر بھارت کے قبضے کے بعد یہ ان پہلے فوجیوں میں سے ہیں جنھوں نے وہاں اپنے فرائض سرانجام دیے۔ یہ وہ فوجی ہیں جنھیں وہاں بھجواتے ہوئے اس طرح کا لباس اور ہتھیار فراہم نہیں کیے گئے تھے جو ہمارے فوجیوں کو آج سیاچن پر بھجواتے ہوئے فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ان فوجیوں نے وہاں اپنی چوکیاں بھی قائم کیں اور وطن کی سرحد کا دفاع کرتے ہوئے دشمن کو پورے سیاچن پر قابض ہونے سے روکا۔"

میں بالکل خاموشی کے ساتھ ٹرانسمیشن سن رہا تھا۔

"میں دعوت دیتا ہوں صوبیدار (ریٹائرڈ) کریم بخش ستارۂ جرأت کو کہ وہ اسٹیج پر تشریف لائیں۔"

میں نہیں جانتا کہ کریم بخش سے پہلے کمپیئر کتنے مہمانوں سے گفتگو کر چکا تھا مگر ہال میں گونجنے والی تالیوں کی آواز بہت پُر جوش نہیں تھی۔

"ہمارے مہمان کو اسٹیج تک پہنچنے میں کچھ وقت لگ رہا ہے کیونکہ وہ پچھلی نشستوں میں بیٹھے ہیں مگر یہ تاخیر ہمارے لیے باعث زحمت نہیں ہے۔"

کمپیئر اب کہہ رہا تھا۔ پچھلی نشستوں پر؟ اور اگلی نشستوں پر کون بیٹھا ہوگا...... میں تصور کر سکتا تھا...... جنرلز...... وزیر...... بیوروکریٹس...... میں قدرے تلخی سے مسکرایا۔

..........❁..........

کریم بخش نے یک دم چونک کر کمپیئر کو اپنا نام لیتے ہوئے سنا۔ پچھلے پون گھنٹہ میں وہ کتنے ہی لوگوں کو اسٹیج پر جاتے اور کمپیئر سے گفتگو کرتے ہوئے اپنے تجربات سناتے دیکھا تھا۔ بعض کی باتوں پر اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ بعض کی باتوں پر فخر سے اس کا سینہ تن گیا تھا...... بعض کی باتوں پر اس نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ تالیاں پیٹی تھیں، اتنی تالیاں کہ اس کے ہاتھ سن سے ہو گئے تھے۔ وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ ابھی اسے بھی اسٹیج پر جانا اور پھر وہ سب کچھ دہرانا ہے جو...... اور اب کمپیئر کے نام لینے پر وہ اچانک گھبرا گیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کدھر سے اسٹیج پر جائے، حالانکہ ریہرسل کے دوران اسے بھی دوسروں کے ساتھ ضروری ہدایات دی گئی تھیں۔

پھر قدرے کانپتی ہوئی ٹانگوں اور جسم کے ساتھ وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور اپنی رو سے نکلنے لگا...... وہ لوگوں کی اپنے چہرے پر جمی ہوئی نظریں دیکھ سکتا تھا...... اور وہ ان تالیوں کو بھی سن رہا تھا جو اس کے لیے بج رہی تھیں۔ سیڑھیاں اتر کر پہلی رو کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے لاشعوری طور پر رک کر وہاں بیٹھے ہوئے جنرلز کو سیلوٹ کیا...... ان میں سے چند نے بے تاثر چہرے اور گردن کے ایک ہلکے سے خم کے ساتھ اس کے سیلوٹ کا جواب دیا...... مگر پھر وہ وہاں رکا نہیں...... وہ اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

''کریم بخش صاحب! آپ نے سیاچن پر کافی عرصہ گزارا اور وہاں چوکی قائم کی تھی...... آپ اپنے ان تجربات سے ہمیں بھی آگاہ کریں۔'' کمپیئر کریم بخش سے گفتگو کا آغاز کر رہا تھا۔

''آپ سیاچن پر بھجوائے جانے والے پہلے فوجیوں میں سے ایک تھے...... آپ بتائیے، جب آپ وہاں پہنچے تو کیا تھا وہاں؟''

''برف۔'' کریم بخش کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ہال میں کچھ کھلکھلاہٹیں ابھریں۔ کریم بخش اب جیسے خلا میں کسی غیر مرئی چیز کو دیکھ رہا تھا۔

''برف......'' میں نے تھکے ہوئے انداز میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا دی...... ''ہاں برف کے علاوہ یہ اور ہے بھی کیا۔'' میں نے سوچا...... برف کا قبرستان ہے یہ وہی برف جو اس وقت میرے چھ ساتھیوں کو ڈھانپ چکی ہے۔

ریڈیو میں سے آواز نہیں آ رہی تھی۔ کریم بخش شاید کچھ اور لفظوں کی تلاش میں تھا...... یہاں موجود برف دن کی روشنی میں آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے اور رات کے اندھیرے میں ہر چیز نگل لیتی ہے...... یہاں صرف دشمن کا خوف نہیں ہوتا...... برف کا خوف بھی ہوتا ہے۔ شاید میں بھی کمپیئر کے اس سوال پر اسی طرح ایک لفظ بول کر گونگا ہو جاتا۔ میں انتظار کر رہا تھا اس شخص کے منہ سے نکلنے والے لفظوں کا۔

''بہت...... برف...... تھی...... تھی وہاں...... پ۔'' اس نے لڑکھڑاتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ ''کبھی یک دم...... پیروں کے نیچے سے زمین غائب ہو جاتی...... نہیں برف غائب ہو جاتی...... پھر پتا بھی نہیں چلتا تھا...... کہ...... کہ......'' وہ اپنی بات مکمل نہیں کر سکا۔ ایک بار پھر وہ اسی طرح خلا میں گھورنے لگا۔ کمپیئر نے مداخلت کی۔

''آپ پہلے فوجیوں میں سے ایک تھے؟''

''جی۔''

''کیا مشکلات پیش آئیں آپ کو وہاں بھجوائے جانے...... پر...... خاص طور پر تب جب آپ کے پاس آج جیسی سہولیات بھی نہیں تھیں؟''

''کوئی مشکلات پیش نہیں آئیں۔'' کریم بخش نے یک دم کسی مشین کی طرح کہا۔

''جذبہ تھا ہم میں...... ہم لڑنے گئے تھے وہاں۔''

میں اب اس آدمی کے لہجے کو پہچان سکتا تھا کسی مشین کی طرح اب وہ، وہ باتیں کہہ رہا تھا جو طوطے کی طرح رٹائی جاتی ہیں۔ وہ سامنے بیٹھے اتنے جنرلز کے سامنے اس خوف کا اظہار نہیں کر پا رہا ہوگا جس کا شکار وہ پہلی دفعہ وہاں آ کر ہوا ہوگا...... میں جانتا تھا، میں محسوس کر سکتا تھا...... اس کی تنہائی کو...... اس کے خوف کو......

''مگر پھر بھی کچھ تو مسائل پیش آئے ہوں گے آپ کو؟'' کمپیئر نے اصرار کیا۔

''ہاں تھوڑے بہت مسائل پیش آئے تھے...... وہاں کچھ بھی نہیں تھا...... ہم نیچے سے 20 لوگ اوپر جانے کے لیے چلے تھے مگر وہاں صرف تین پہنچے تھے۔''

کریم بخش ایک بار پھر جیسے کسی ٹرانس میں چلا گیا۔ ''رستے میں پتا نہیں چلتا تھا...... کون کہاں گیا...... کون

کہاں پھسل گیا...... ہم ایک دوسرے کے ساتھ رسی باندھ کر چلتے تھے پھر بھی...... وہاں برف سے ڈھکی ہوئی کھائیاں تھیں۔ ہم ایک دوسرے کو بچا بھی نہیں سکتے تھے۔

پہلی رو میں بیٹھے ہوئے ایک افسر نے جماہی لی...... شو کچھ زیادہ ہی لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ اسے ابھی ایک پارٹی میں بھی شرکت کرنی تھی اور وہاں کا ماحول یقیناً یہاں کے ماحول کی طرح sombre نہیں ہوگا۔ اس نے قدرے بیزاری کے ساتھ سوچا۔ ''اب ان جنرلز کی وجہ سے میں اٹھ کر جا بھی نہیں سکتا۔ اور اوپر سے یہ فضول آدمی اتنے لمبے pause لے رہا ہے...... اس کو چاہیے جلدی بات ختم کرے۔'' وہ بیزاری سے اسٹیج کو دیکھنے لگا۔

''آپ کے چہرے پر یہ جو نشانات ہیں یہ کس چیز کی وجہ سے ہیں؟'' کمپیئر اب اس آدمی سے پوچھ رہا تھا۔

کریم بخش نے بے اختیار اپنی ناک کو چھوا۔ ''برف سے جل گیا تھا میں......''

''فراسٹ بائٹ۔'' میں نے زیر لب دہرایا۔ دو دن پہلے میں اس کا شکار ہوا تھا جب میں اوندھے منہ برف پر گرا تھا اور......

''میں خوش قسمت تھا میرے ہاتھ اور پیروں کی صرف تمام انگلیاں ہی کاٹنی پڑیں...... باقی بہت سے ساتھیوں کی ٹانگیں اور بازو بھی کاٹنے پڑے۔'' کریم بخش نے دسیوں انگلیوں سے محروم اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

''اب ختم بھی کریں یہ انٹرویو...... پتا نہیں...... ابرار کو کب بلائیں گے...... میں اس کے گانے سننے کے لیے آیا ہوں اور یہ اسے بلا ہی نہیں رہے۔'' ہال کی ایک نشست پر بیٹھے ہوئے ایک ٹین ایجر نے اپنے دوست سے بیزاری کے ساتھ کہا۔

''میں خود شاہدہ منی کے انتظار میں بیٹھا ہوں...... پہلے گانا گوانا چاہیے تھا اس سے۔'' اس کے دوست نے کہا۔ ''بہت بور فنکشن ہے۔ مجھے پتا ہوتا تو میں نہ آتا۔'' پہلے ٹین ایجر نے کہا۔

''بہت سے ساتھیوں کی تو لاشیں بھی واپس نہیں لا سکے...... وہ مل ہی نہیں سکیں۔'' کریم بخش کہہ رہا تھا......

مجھے ان چھ لاشوں کا خیال آیا جو اس وقت برف کی دبیز تہ میں دب چکی ہوں گی...... ان میں سے بھی شاید ہی کسی کو واپس بھیجا جا سکے...... یہ واقعی برف کا قبرستان ہے...... میں نے ایک جھرجھری سی لی...... ریڈیو سے اب کریم بخش کی آواز کے بیک گراؤنڈ میں بھی دبی دبی آوازیں ابھر رہی تھیں...... وہ مائیکروفون جو ہال میں تالیوں کی آواز کو capture کرنے کے لیے نصب کیے گئے تھے۔ وہ ہال میں موجود حاضرین کی سرگوشیوں کو بھی transmit کر رہے تھے۔

''اچھا کریم بخش صاحب آپ کو کبھی افسوس ہوا، اپنی انگلیوں کے ضائع ہونے پر؟'' کمپیئر نے کریم بخش سے پوچھا۔

''نہیں کبھی نہیں...... میں نے یہ قوم کے لیے قربان کی تھیں...... قوم کے مستقبل کے لیے...... کل آنے والے بچوں کے لیے...... افسوس کیوں ہوتا مجھے؟'' ہال میں اس کی گفتگو کے دوران پہلی بار تالیاں گونجیں......

کریم بخش نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس نے کمپیئر کو سانس اور جلد کی ان بیماریوں کے بارے میں نہیں بتایا تھا جن کا شکار وہ پچھلے سولہ سال سے چلا آ رہا تھا۔ فوج سے اس کی جلد ریٹائرمنٹ کی وجہ بھی یہی تھی...... مگر اس نے کبھی

اپنی بیماریوں کا ذمہ دار فوج اور سیاچن کو نہیں گردانا تھا......

"میں نہیں جاتا کوئی اور جاتا...... مگر کسی نہ کسی کو تو وہاں جانا ہی تھا...... اور جو بھی جاتا اس کے ساتھ یہی ہوتا...... پھر میں کیا کہوں کہ یہ میرے ساتھ کیوں ہوا...... میں نے اور میرے ساتھیوں نے تو ان لوگوں کے لیے وہاں بنیادیں فراہم کی تھیں...... جو آج وہاں ہیں...... بنیاد کا پتھر بنے تھے ہم...... ہم پر کتنا بوجھ پڑا۔ کیا معنی رکھتا ہے اس احساس کے سامنے کہ ہم نے جو کچھ کیا، قوم کے لیے کیا۔" کریم بخش نے ستارۂ جرأت کو چھوتے ہوئے سوچا تھا۔

"کریم بخش صاحب! آپ نوجوان نسل کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟" کمپیئر اب کریم بخش سے پوچھ رہا تھا۔ میں بیک گراؤنڈ میں ابھرنے والی سرگوشیاں سن رہا تھا۔ ناراضی کی ایک لہر سی میں نے اپنے اندر اٹھتی محسوس کی۔ کیا ہال میں بیٹھے ہوئے ان لوگوں کو احساس نہیں ہے کہ یہ ایک قومی ہیرو کی چند منٹوں پر مشتمل گفتگو خاموشی سے سن سکیں...... وہ قومی ہیرو جو سیاچن کی پاگل کر دینے والی خاموشی اور تنہائی کا سامنا صرف ان لوگوں کے لیے کرتا ہے۔

"میرا پیغام یہ ہے کہ۔" وہ ایک بار پھر رک گیا تھا۔ ہال میں ایک بار پھر سرگوشیاں ابھریں...... میں ہمہ تن گوش اس شخص کی بات سننے کے لیے بیٹھا تھا اور مجھے ابھرنے والی ان آوازوں پر غصہ آ رہا تھا۔ جن کی وجہ سے میرے لیے کریم بخش کی بات سننا مشکل ہو رہا تھا۔

"دیکھیں......" کریم بخش نے گلا صاف کیا۔ "میں کوئی...... کوئی...... بہت...... پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں۔" اس نے اٹکتے ہوئے بات شروع کی۔

"مجھے تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا...... مگر کچھ حالات کی وجہ سے میں زیادہ نہیں پڑھ سکا......" وہ رکا۔

کمپیئر نے اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ قائم رکھنے کے لیے جدوجہد کی...... خاتون کمپیئر نے اپنے تراشیدہ کھلے بالوں میں ایک بار ہاتھ پھیرا...... دونوں کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کریم بخش جواب دیتے ہوئے ٹریک سے اتر گیا تھا اور اب دونوں ایک دوسرے کو ایک لحظہ کے لیے دیکھتے ہوئے طے کر رہے تھے کہ مداخلت کون کرے گا۔

"ساری عمر مجھے اس کا بڑا افسوس رہا...... مگر اب میں سمجھتا ہوں کہ میں خوش قسمت ہوں جو زیادہ نہیں پڑھا...... شاید زیادہ پڑھے لکھے نہ ہونے کی وجہ سے میں اس ملک اور قوم سے اندھی محبت کرتا ہوں۔ زیادہ پڑھ لکھ جاتا تو آج یہاں بیٹھ کر ملک میں کیڑے نکال رہا ہوتا۔" میری آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیرنے لگی۔

"میں کوئی بڑا امیر آدمی نہیں ہوں...... چند مربع زمین ملی تھی مجھے جس پر میں اپنے بیٹوں کے ساتھ کاشت کاری کرتا ہوں۔"

مرد کمپیئر کے کان میں اڑسے ہوئے ننھے سے ہیڈ فون میں پروگرام پروڈیوسر کی آواز گونجی۔

"ایک منٹ کے بعد بات کاٹ دینا اور اس بار انٹرویو کو وائنڈ اپ کر دینا...... نیکسٹ اینٹری......" آواز بند ہو گئی۔

"مگر میں پھر بھی مطمئن ہوں...... وطن کے لیے کچھ قربان کر دینے سے وطن کا قرض نہیں اترتا...... مجھے اگر افسوس ہے تو صرف یہی کہ میں غازی بنا شہید نہیں...... اور...... اور مجھے اگر فخر ہے تو صرف اس بات پر کہ میں نے وطن

سے نمک حرامی نہیں کی۔ میری نوجوان نسل سے یہی درخواست ہے کہ اس ملک کی قدر کریں۔''
کریم بخش اب خاموش ہو گیا تھا۔
''آپ نے بہت اچھا پیغام دیا، ہم یقیناً اس ملک کی قدر کریں گے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' کمپیئر نے قدرے جلد بازی کے انداز میں انٹرویو کا اختتام کرتے ہوئے کہا۔
میں ریڈیو سے گونجنے والی ان تالیوں کی ہلکی سی آواز کو سن رہا تھا جو کریم بخش کے جانے پر بجائی جا رہی تھیں۔ دائیں ہاتھ سے میں نے اپنی آنکھوں میں اترنے والی نمی کو صاف کیا۔ شاید آج سے دس پندرہ سال بعد میں بھی ایسے ہی کسی پروگرام میں یہی ساری باتیں دہرا رہا ہوں گا۔ وطن سے محبت کی...... نمک حلالی کی...... اور شاید یہاں کوئی اسی طرح ریڈیو پر بیٹھا یہ سب سن رہا ہوگا۔
''جی ظفر...... اب پروگرام میں آگے کیا ہے؟'' خاتون کمپیئر، مرد کمپیئر سے پوچھ رہی تھی۔
''یہ تو حاضرین سے پوچھنا چاہیے۔'' مرد کمپیئر نے کہا۔
''ان سے پوچھ لیتے ہیں...... اگلے مہمان کو بلایا جائے یا پھر کسی سنگر کو؟'' کمپیئر اب حاضرین سے پوچھ رہا تھا۔
''نو انٹرویو...... نو گیسٹ...... سنگر...... سنگر......'' ریڈیو سے گونجنے والی آوازیں بہت نمایاں تھیں۔
ایک لمحہ کے لیے مجھے اپنا خون کھولتا ہوا محسوس ہوا۔ سنگر...... سنگر چلانے والے ان لوگوں کو کیا یہ پتا ہے کہ اس وقت بھی ان کے اس عیش و آرام کے لیے کوئی کہاں کہاں بیٹھا ہے۔
''تو ٹھیک ہے، ہم ابرارالحق کو دوبارہ بلاتے ہیں...... پچھلی بار انھوں نے ملی نغمہ سنایا تھا...... اس بار ہم ان سے ان کا ہٹ سونگ اساں تے جاناں مال و مال سنتے ہیں۔''
کمپیئر کے کہنے پر ہال میں تالیوں کی آواز گونج اٹھی تھی...... تالیوں اور سیٹیوں کا اتنا شور تھا کہ مجھے ریڈیو کا والیم قدرے کم کرنا پڑا۔ مجھے وہ تالیاں یاد آئیں جو ان لوگوں نے کریم بخش کی آمد پر بجائی تھیں۔
گلوکار اب اپنا گانا شروع کر چکا تھا۔ میں تصور کی آنکھ سے ہال میں بیٹھے ہوئے لڑکے اور لڑکیوں کو ناچتے ہوئے دیکھ سکتا تھا...... برگر کلاس کے برمودا شارٹس اور جینز میں ملبوس لڑکے اور لڑکیاں......
''ہاتھ اٹھا کر...... سب مل کر......'' ابرارالحق اب ہدایات دے رہا تھا...... میں نے خون آلود دستانے میں چھپا ہوا بایاں ہاتھ اٹھا کر دیکھا...... اڑتالیس گھنٹوں میں پہلی بار مجھے اس ہاتھ کے زخمی ہونے پر افسوس ہوا اور یہ تصور کر کے تکلیف کہ اسے علیحدہ کر دیا جائے گا۔
''اساں تیری گل کرنی...... گل کرنی اے ڈیڈی نال، اساں تیری گل کرنی۔'' گلوکار لہک لہک کر گا رہا تھا۔
وہاں بیٹھے ہوئے زندگی میں پہلی بار میں نے سوچا...... کیا ضروری تھا میں فوج میں آتا...... اور اس قوم کے لیے ان پہاڑوں پر اپنے جسم کے حصوں کو باری باری خود سے جدا ہوتے دیکھتا، ضائع کرتا۔ جو یہ بھی نہیں جانتی کہ شہید یا غازی کا احترام کیا ہوتا ہے...... میری عمر کے بہت سے لڑکے ابھی تعلیم حاصل کر رہے ہوں گے...... یونیورسٹیز میں، کالجز میں...... بیرون ملک...... اور میں چوبیس سال کی عمر میں اگلے کچھ دنوں کے بعد اپنا ہاتھ کٹوا کر ترقی کی ریس سے

باہر ہو جاؤں گا...... کس کے لیے؟

. ان لوگوں کے لیے جو غازیوں کے بجائے گلوکاروں کو اہمیت دیتے ہیں...... جو ہم سے یہ تک سننے کے لیے ہمیں چند منٹ نہیں دے سکتے کہ ہم نے موت کو کہاں سے کس طرح جا کر دیکھا...... صرف اس لیے کہ ملک کے اندر بیٹھے ہوئے ان لوگوں کے عیش و آرام پر کوئی حرف نہ آئے۔ بیس سال بعد جب میں بھی ایسے کسی اسٹیج پر یہ بتانے جاؤں کہ میرے سینے پر ہاتھ کٹوا کر سجایا جانے والا تمغہ میرے لیے کیا معنی رکھتا ہے...... تو شاید میں بھی کریم بخش کی طرح بات کرتے ہوئے لڑکھڑاؤں گا...... اور شاید میرے انٹرویو کے بعد بھی حاضرین اگلے کسی مہمان کے بجائے کسی سنگر کو بلوانے کی فرمائش کریں گے تاکہ اس بوریت کا سدباب ہو سکے جو انھیں پچھلے چند منٹوں کے دوران برداشت کرنی پڑی۔ میں کیوں پاکستان کی ان آنے والی نسلوں کے لیے اپنا حال قربان کروں، جن کے لیے ہر چیز گانے سے شروع ہو کر ناچنے پر ختم ہو جاتی ہے۔ جن کے لیے ہر اہم تہوار چھٹی کا ایک اور دن اور ایک اور میوزیکل ایوننگ سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہوتا...... اور وہ انسان پاگل ہیں جو رات کی اس تاریکی میں اندھوں کی طرح چھڑیوں سے، کھائیاں ٹٹولتے...... ہڈیوں میں اتر جانے والی اس سردی میں کئی گھنٹوں کا سفر کر کے یہاں پہنچیں گے...... پہنچیں گے بھی یا نہیں۔

اور اس ہیلی کاپٹر کے پائلٹ بھی پاگل ہیں جو اپنے پروفیشنل سرٹیفکیٹس اور ڈگریوں کے ساتھ عقل کو بھی بھاڑ میں جھونکتے ہوئے ان لوگوں کو ان پہاڑوں میں اتارنے کے لیے چل پڑیں گے...... شہادت کی صورت میں انھیں ایک اور ستارۂ جرأت مل جائے گا زندہ رہنے پر ایسے کسی شو میں شرکت کا دعوت نامہ بھی...... اور بس زندہ قومیں اپنے شہیدوں اور غازیوں کی قربانیوں کو بھلاتی نہیں ہیں...... مگر ان کے پاس ان قربانیوں کے لیے عزت نہیں ہوتی...... میرا دل چاہ رہا ہے، میں اب یہاں سے بھاگ جاؤں۔

پہلی بار میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں...... میں یہاں ان لوگوں کے لیے......

وائرلیس پر میرے لیے کوئی پیغام آ رہا ہے...... میں نے وائرلیس آن کیا۔

''مورال کیسا ہے کیپٹن ولید؟'' دوسری طرف سے میرے CO نے کہا "skyhigh sir" (آسمان سے اونچا) پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں چودہ دفعہ میں نے یہ کہا تھا۔ مگر اس بار میں کچھ بھی نہیں بول سکا تھا۔

''مورال کیسا ہے؟'' انھوں نے ایک بار پھر دہرایا۔

''مورال؟'' میں بڑبڑایا۔

''کس کو بلائیں اگلے مہمان کو یا سنگر کو؟'' ''نو انٹرویو...... نو گیسٹ...... سنگر...... سنگر......''

''مورال کیسا ہے کیپٹن ولید؟''

''مورال۔'' میں پھر بڑبڑایا۔

''پتا نہیں سر۔'' میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

# بند کواڑوں کے آگے

میں نے پہلی بار اسے گورنمنٹ کالج کے ایک فنکشن میں دیکھا تھا۔ وہ اسٹیج سیکرٹری تھی اور ہر شخص، ہر چیز پر حاوی سی لگ رہی تھی۔ گفتگو کے فن سے آشنا تھی اور آواز کی خوبصورتی اپنی جگہ تھی۔
میں نے اسے بہت قریب سے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی ایسی کوئی خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ میں نے اس وقت انٹر میں نیا نیا داخلہ لیا تھا اور وہ وہاں گریجویشن کی طالبہ تھی۔ یہ ضرور تھا کہ پہلی بار کو ایجوکیشن میں آنے کے بعد میں لڑکیوں سے کچھ خائف تھا لیکن اس وقت جس عمر میں تھا قدرتی طور پر مجھے صنف مخالف میں کافی دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔
لیکن بہرحال مجھے اس سے متاثر ہونے کے باوجود اس کے پاس جانے یا ملنے کا شوق نہیں ہوا۔ وجہ بالکل واضح تھی، مجھے اس وقت لڑکیوں میں جو چیزیں اٹریکٹ کرتی تھیں ان میں سے کچھ بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ نہ اس کے نین نقش تیکھے تھے، نہ بال لمبے تھے، نہ رنگت چاند کی طرح تھی، نہ دانت موتیوں جیسے تھے، نہ چال ہرنی جیسی تھی، نہ ہی وہ فیشن ایبل تھی۔ ہاں مگر اس کا قد بہت دراز تھا۔ اس فنکشن میں، میں بس دور سے اتنا ہی دیکھ سکا تھا۔
میں کوئی علامہ قسم کا اسٹوڈنٹ بھی نہیں تھا جو اس کے انداز گفتگو میں خوبصورت الفاظ کے انتخاب سے متاثر ہو جاتا سو بس چند گھنٹے وہاں گزارنے اور اس کے بعد اپنے دوستوں کے ساتھ اس فنکشن پر تبصرہ کرتا ہوا میں واپس گھر آ گیا تھا۔ رابیل علی سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔
کالج میں داخلہ لینے کے چند ماہ بعد ہی جونیئر ورلڈ کپ میں حصہ لینے والی پاکستانی ٹیم میں میرا انتخاب ہو گیا تھا۔ اور تعلیم سے میری توجہ بالکل ہی ہٹ گئی تھی۔ اس زمانہ میں کرکٹ ہی میرے لیے سب کچھ تھی۔ تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے مجھ پر کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ میری فیملی بہت امیر نہیں تھی لیکن بہرحال ہم کھاتے پیتے لوگوں میں شمار ہوتے تھے، خاص طور سے جب سے میرے بڑے دونوں بھائی بھی کمانے لگے تھے تب سے ہماری مالی پوزیشن کافی اچھی ہو گئی تھی۔
شروع میں گھر والوں نے مجھے کرکٹ کھیلنے سے منع کرنے کی کافی کوشش کی تھی لیکن بہرحال میں ان کی چالوں

اور باتوں میں نہیں آیا۔ کرکٹ میرا شوق نہیں، جنون تھا اور اس جنون نے گھر والوں کو بھی اپنے حصار میں لے ہی لیا تھا۔ کلب کرکٹ کھیلتے کھیلتے جب اچانک میری سلیکشن انڈر 19 ٹیم کے لیے ہوگئی تو میرے ساتھ ساتھ میرے گھر والے بھی بہت خوش تھے۔

پھر میں جونیئر ورلڈ کپ کے لیے انگلینڈ چلا گیا۔ پاکستان کی مجموعی پرفارمنس وہاں پر زیادہ بہتر نہیں رہی لیکن جن چند کھلاڑیوں نے بین الاقوامی میڈیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی تھی ان میں، میں بھی تھا۔ پتا نہیں کون کون سے خطاب تھے جو مجھے دے دیے گئے تھے۔ مجھے پاکستان کی باؤلنگ کا مستقبل قرار دے دیا گیا تھا اور میں جیسے ان پچیس دنوں میں مستقل ہواؤں میں رہا تھا۔ گمنامی سے ایک دم دنیا کے سامنے آنا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کوئی چمگادڑ یک دم سورج کے سامنے آجائے۔

میں خوبصورت اور کم عمر تھا۔ ٹیلنٹڈ تھا اور مجھے ان سب چیزوں کا احساس تھا۔ جونیئر ورلڈ کپ کے اختتام کے ساتھ ہی انگلینڈ میں لیگ کرکٹ میں حصہ لینے والے ایک کلب کے ساتھ میرا معاہدہ ہوگیا تھا۔ اور پھر چند ہی ماہ میں مجھے بہت سے ملکوں کی جونیئر ٹیموں کے ساتھ کھیلنے کا موقع ملا تھا۔ میں پاکستان کی جونیئر ٹیم کا ایک مستقل رکن بن گیا تھا۔

مجھے یاد ہے جب میں دوبارہ کالج آیا تھا تو تقریباً آٹھ ماہ گزر گئے تھے۔ کالج سے میرا نام خارج نہیں کیا گیا تھا، وجہ صرف کرکٹ ہی تھی اور میں جانتا تھا کہ اب میں ایک دوسرا احسن منصور ہوں۔ کالج میں میری بہت زیادہ شناخت نہیں ہوئی تھی کیونکہ ظاہر ہے ایک جونیئر ٹیم کا کھلاڑی لائم لائٹ میں اس طرح نہیں رہتا جس طرح سینئر کھلاڑی رہتے ہیں مگر جتنی شہرت اور شناخت مجھے حاصل تھی میں اس پر بھی خوش تھا۔ اب میرا چہرہ ایک عام چہرہ نہیں رہا تھا۔ میں خود کو دوسروں سے منفرد اور ممتاز سمجھنے لگا تھا خاص طور پر لڑکیوں میں میری مقبولیت بڑھ گئی تھی۔ یا کم از کم مجھے تو ایسا ہی لگتا تھا۔

مجھے یاد ہے چند ماہ بعد میں نے ایک صبح اخبار میں رابیل علی کی تصویر دیکھی تھی۔ اس نے BA میں ٹاپ کیا تھا اور اس کا چہرہ دیکھتے ہی مجھے وہ فنکشن یاد آ گیا تھا جس میں، میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ میں کچھ مرعوب سا ہوا تھا آخر BA میں ٹاپ کرنا کوئی معمولی بات تو نہیں تھی لیکن یہ احساسات صرف کچھ دیر کے لیے ہی تھے۔ میں جلد ہی اسے ایک بار پھر بھول گیا تھا۔ ان ہی دنوں آسٹریلیا کا ٹور کرنے والی پاکستانی ٹیم کے لیے میرا انتخاب کیا گیا تھا اور میں جیسے خوشی سے پاگل ہوگیا تھا۔

میں صرف سترہ سال کا تھا اور اس عمر میں یک دم پاکستانی کرکٹ ٹیم میں بغیر کسی سفارش کے آجانا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ مبارکبادوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو شروع ہوگیا تھا۔ اگلے دن کالج میں بھی میں سب کی توجہ کا مرکز بنا رہا یہاں تک کہ کچھ اساتذہ نے بھی مجھے کلاس میں ہی مبارکباد دی تھی۔

پھر میں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کا ٹور کرنے والی ٹیم کے ساتھ چلا گیا اور میرے کیریئر کا باقاعدہ آغاز ہوگیا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کون سی طاقت تھی لیکن بہرحال میرا ہر پانسہ سیدھا ہی پڑتا رہا۔ میں صرف ایک باؤلر

تھا لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ بیٹنگ میں دلچسپی نہ ہونے کے باوجود میری پرفارمنس اس میں بھی شاندار رہی تھی۔ جہاں سپر اسٹارز فلاپ ہونا شروع ہوتے وہاں کبھی میری بیٹنگ رنگ جمانے لگتی اور کبھی میری باؤلنگ اپنی دھاک بٹھانے لگتی۔

جب ان دونوں سیریز میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد میں پاکستان واپس لوٹا تھا تو میری گردن کے کلف میں اور اضافہ ہو چکا تھا۔ میری باتوں کا انداز بدل چکا تھا کیونکہ میں بدل چکا تھا۔ ہر ماہ گھر والوں سے پانچ چھ سو جیب خرچ لینے والے کے پاس اب اتنے پیسے تھے کہ وہ گھر والوں پر ڈھیروں روپے خرچ کر سکے۔ اخبارات میں میری پرفارمنس پر خصوصی کالم لکھے جا رہے تھے۔ اسپورٹس میگزین مجھ پر خصوصی ضمیمے نکال رہے تھے۔ مختلف ڈیپارٹمنٹس کی طرف سے مجھے اپنے لیے کھیلنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ میں اب اسٹار آل راؤنڈرز کی صف میں شامل ہو گیا تھا اور اس سب کے لیے مجھے نہ سالوں کی محنت کرنی پڑی تھی نہ کوئی طویل جدوجہد۔

پاکستان واپس آنے کے بعد جب میں دوبارہ کالج گیا تھا تو مجھے دیکھتے ہی جیسے ہر ایک حیران ہو جاتا تھا۔ آٹوگرافس لینے والوں کا ایک بڑا ہجوم تھا جس نے مجھے پہلے دن اپنے گھیراؤ میں رکھا اور ظاہر ہے اس میں لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ اور میں یقیناً زندگی میں یہی سب کچھ چاہتا تھا۔ میں اب لڑکیوں سے پہلے کی طرح خائف نہیں تھا۔ بیرونی دوروں نے صنف نازک کے سامنے میری گھبراہٹ کو ختم کر دیا تھا۔ اب میں ان کے تبصروں کے جواب اتنے ہی شوخ انداز میں دیتا تھا۔ لیکن اب کالج میرا آنا جانا کافی کم ہو گیا تھا میں صرف خانہ پری کے لیے ہی کبھی کبھار وہاں جاتا تھا ورنہ مجھے نہ تو تعلیم میں پہلے کوئی دلچسپی تھی نہ ہی اب تھی بس میرے والدین کا اصرار تھا کہ میں گریجویشن ضرور کر لوں چاہے تھرڈ ڈویژن میں ہی سہی اور میں نے ان کے اصرار پر سر جھکا دیا تھا۔

رابیل علی سے میری پہلی باقاعدہ ملاقات تب ہوئی تھی جب کالج نے اپنے ایک سالانہ فنکشن میں کچھ نامور لوگوں کے ساتھ مجھے بھی مدعو کیا۔ وہ اب انگلش ڈیپارٹمنٹ میں ایم اے انگلش کی طالبہ تھی اور اس فنکشن میں ایک بار پھر اسٹیج سیکرٹری کے طور پر سامنے آئی تھی لیکن پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لوگوں میں بہت پاپولر ہے۔

میرے کچھ دوستوں نے مجھے اس فنکشن کا آغاز ہونے سے پہلے ہی اس کے بارے میں خبردار کیا تھا کہ وہ بہت تیکھے سوال کرتی ہے اور زیادہ تر مد مقابل کو لاجواب کر چھوڑتی ہے لیکن جو عجیب بات مجھے اپنے دوستوں کے رویے میں محسوس ہوئی تھی وہ رابیل کے لیے احترام تھا۔ میرے دوستوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو لڑکیوں کے بارے میں تبصرے کرتے ہوئے محتاط رہتا مگر رابیل کے بارے میں وہ بڑے محتاط انداز میں بات کر رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ لاشعوری طور پر اس سے مرعوب تھے۔

مجھے ان کے رویے پر کافی حیرانگی ہوئی تھی۔ مجھے یاد ہے میں نے بڑی لاپرواہی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن میرے دوست عمر نے کہا تھا:

"دیکھیں گے تم بھی کتنے پانی میں ہو۔ اس کے سامنے ساری چوکڑیاں نہ بھول جاؤ تو میرا نام بدل دینا۔"

رابیل کے بارے میں اس جملے نے میرے تجسس اور تشویش دونوں کو بڑھا دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ

پروگرام کے آغاز سے پہلے میں اس سے ملوں اور پوچھوں کہ وہ مجھ سے کس قسم کے سوالات کرے گی اور جب میں نے اپنے دوستوں سے اس بات کا اظہار کیا تو عجیب سارسپانس انھوں نے دیا تھا۔ عمر نے کندھے اچکائے تھے۔ حسن نے سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹ سکوڑے تھے۔ عادل جھینپی سی ہنسی ہنسنے لگا تھا۔

یک دم مجھے احساس ہوا کہ وہ سب اس کے پاس جانے سے گھبرا رہے تھے۔ ایسے جیسے وہ بے حد کنفیوز ہو گئے تھے۔ لیکن بہرحال وہ میرے ساتھ اس کے پاس جانے پر آمادہ ہو گئے۔ پھر کچھ دیر کے بعد میں رابیل علی کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اس فنکشن کے انچارج سر عمانوئیل اور چند دوسرے اسٹوڈنٹس کے ساتھ کھڑی کچھ پیپرز دیکھ رہی تھی اور شاید کسی موضوع پر کچھ بحث بھی ہو رہی تھی۔

سر عمانوئیل نے مجھے دور سے دیکھ لیا تھا اور وہ تیزی سے میرے پاس آئے تھے۔ بڑی گرم جوشی سے انھوں نے میرا حال احوال پوچھا تھا اور فنکشن میں آنے کے لیے شکریہ ادا کیا تھا پھر وہ مجھے میری نشست پر لے جانا چاہتے تھے لیکن میں نے ان سے کہا کہ میں رابیل علی سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں اگر وہ اسے میرا پیغام دے دیں تو میں ان کا بہت مشکور ہوں گا۔ وہ مسکراتے ہوئے رابیل کے پاس چلے گئے تھے۔ اور چند لمحے بعد میں نے رابیل اور اس کے ساتھ کھڑے دوسرے لڑکوں کو اچانک اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھا۔ وہ ان پیپرز کو رول کرتی ہوئی میری طرف آ گئی تھی اور پتا نہیں کیوں لیکن مجھے لگا تھا کہ میں اتنا ہی کنفیوز ہوں جتنے میرے دوست ہیں۔ میرے پاس آ کر اس نے مسکراتے ہوئے مجھے وش کیا تھا:

''سر عمانوئیل کہہ رہے تھے کہ آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہے ہیں۔''

اس نے بغیر کسی توقف کے مجھ سے پوچھا اور یک دم مجھے لگا کہ میرا سارا اعتماد رخصت ہو گیا ہے لیکن بہرحال اپنی ساری ہمت کو اکٹھا کرتے ہوئے میں نے اس سے کہا:

''وہ اصل میں میرے دوست کہہ رہے تھے کہ آپ اسٹیج پر اپنے سوالوں اور باتوں سے بہت پریشان کرتی ہیں۔''

اس کے چہرے پر میری بات سن کر حیرانگی کے تاثرات نمودار ہوئے تھے لیکن پھر اس نے ایک گہری مسکراہٹ کے ساتھ میرے دوستوں کو دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''آپ کے کون سے دوست کہہ رہے ہیں کہ میں اسٹیج پر اپنے سوالوں سے پریشان کرتی ہوں؟''

میں نے عمر کی طرف اشارہ کیا تھا اور مجھے لگا تھا جیسے عمر وہاں سے دوڑ لگا دے گا کم از کم اس کے چہرے سے مجھے ایسا ہی لگا تھا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے براہ راست عمر سے ہی پوچھا تھا۔ عمر کا نام جاننے کے بعد اس نے کہا تھا:

''دیکھیں عمر! میں پریشان کرنے والے سوال نہیں کرتی، میں اچھے سوال کرتی ہوں تا کہ ان کے جواب بھی اچھے اور منفرد ملیں اور جو لوگ پروگرام دیکھ رہے ہوتے ہیں وہ اسے انجوائے کریں۔ اگر وہی اسٹیریو ٹائپ سوال پوچھے

جاتے رہیں تو مجھے نہیں لگتا کہ کسی کو اس بات میں دلچسپی ہوگی کہ وہ مہمانوں کے ساتھ میری باتیں سنے لیکن بہر حال میں کبھی بھی اپنے پروگرام میں حصہ لینے والوں کو پریشان کرنا نہیں چاہوں گی اور آج کا پروگرام دیکھنے کے بعد آپ ضرور مجھے بتائیے کہ میں نے کون سا سوال ایسا کیا تھا جو پریشان کرنے والا تھا یا جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

وہ بڑی نرمی سے مجھے نظر انداز کیے ہوئے عمر سے مخاطب تھی جو زمین پر نظریں گاڑے کھڑا تھا۔

میں نے آج تک اسے کبھی کسی لڑکی کے سامنے نظریں جھکائے نہیں دیکھا تھا لیکن آج میں نے دیکھ ہی لیا تھا۔ وہ عمر سے بات کرنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"جہاں تک آپ کا تعلق ہے تو ہم سب کو آپ پر بہت فخر ہے۔ ہمارے کالج کو آپ پر ناز ہے کیونکہ آپ بہترین پلیئر ہیں اور میں نہیں سمجھتی کہ آپ کو کوئی خدشہ ہونا چاہیے۔ آپ گراؤنڈ میں اتنے کانفیڈنٹ نظر آتے ہیں تو یقیناً اسٹیج پر بھی ہوں گے اور میں کوشش کروں گی کہ بقول عمر کے کوئی پریشان کرنے والا سوال نہ کروں۔ میرے خیال میں اتنی یقین دہانی کافی ہے ناؤ ایکسکیوزمی مجھے کچھ کام ہے۔"

وہ معذرت کرتی ہوئی واپس چلی گئی تھی۔ میں ان چند لمحوں میں مکمل طور پر اس کا جائزہ لے چکا تھا۔ وہ بلیک اور وائٹ چیک کی شرٹ میں ملبوس تھی۔ بلیک شلوار کے ساتھ اس نے بلیک دوپٹہ لیا ہوا تھا اور جینز کی بلیک جیکٹ کی آستینیں اس نے کہنیوں تک الٹ رکھی تھیں اس کی بائیں کلائی میں ایک رسٹ واچ تھی اور دوسری کلائی بالکل خالی تھی۔ کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں تھیں اور اسٹیپس میں کٹے ہوئے کھلے بالوں میں اس نے ایک ہیئر بینڈ لگا رکھا تھا۔

وہ بہت خوبصورت تو نہیں تھی مگر اس کی آنکھیں اور مسکراہٹ دونوں یقیناً خوبصورت تھیں۔ اس کی آنکھیں بہت چمکدار اور بچوں کی طرح شفاف تھیں یقیناً اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی جو دوسروں کو مرعوب کر دیتی تھی شاید اس کا اعتماد، شاید اس کا انداز گفتگو، شاید اس کی آواز یا شاید یہ سب کچھ..... میں بہر حال کافی متاثر ہوا تھا۔

اور اس دن اسٹیج پر جا کر میں واقعی اپنی ساری چوکڑی بھول گیا تھا۔ اس کے سوال بہت تیکھے تھے اور ان کے پوچھنے کا انداز اس سے بھی سوا تھا۔ جو کمی رہ گئی تھی وہ ہال میں سے آنے والے ریمارکس تھے اور تالیوں اور قہقہوں کا ایک شور تھا جو اس کے ہر سوال پر ہال میں بلند ہوتا تھا۔ مجھے اسٹیج پر بلانے سے پہلے وہ چند دوسرے مہمانوں سے باتیں کرتی رہی تھی اور اس نے ان سے بھی کافی مشکل اور دلچسپ سوال پوچھے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی میری طرح نروس نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ کافی میچور عمر کے تھے لیکن بہر حال میں اپنی اس خود اعتمادی کا کوئی مظاہرہ نہیں کر سکا جس کے لیے میں مشہور تھا۔ میں ایک ہی رات میں جیسے سپر اسٹار سے laughing stock بن گیا تھا۔

وہ اسٹیج پر مجھے اس ننھے بچے کی طرح ٹریٹ کر رہی تھی جس کے ہاتھوں میں کھلونوں کا ایک ڈھیر ہو اور وہ اسے سنبھالنے کی کوشش میں بے حال ہوا جا رہا ہو۔ اس نے میرے ہیئر اسٹائل سے لے کر میرے کھیل اور میری تعلیمی دلچسپیوں سے لے کر میرے گھر آنے والی فون کالز تک کو موضوع بحث بنایا تھا۔ میں اس کے ہر سوال پر بوکھلاتا، کبھی کھسیانی ہنسی ہنستا، کبھی جھینپتا اور جب کبھی اپنی طرف سے معقول جواب دینے کی کوشش کرتا تو ہال سے آنے والی کوئی آواز یا رابیل علی کا کوئی تبصرہ میرے اس جواب کی معقولیت کو یک دم زائل کر دیتا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس نے میرے

لیے بلکہ سارے مہمانوں کے لیے کافی ہوم ورک کیا تھا اور شاید ہال میں بھی اس نے کچھ لوگوں کو کچھ جملے رٹا رکھے تھے جو بروقت بولے جاتے تھے۔

میں اس انٹرویو کے اختتام تک بالکل ہمت ہار چکا تھا اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں وہاں سے بھاگ جاؤں۔ مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ مختلف ڈیپارٹمنٹس باقاعدہ پلاننگ سے میرے ساتھ یہ سلوک کر رہے تھے کیونکہ ہال میں سے جتنے تبصرے مجھ پر کیے گئے تھے۔ وہ ساری آوازیں وہاں سے آتی رہی تھیں جہاں ایم اے کے اسٹوڈنٹس بیٹھے تھے۔ لیکن بہرحال میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ وہ لوگ جیسے مجھے فرسٹ ایپرل فول سمجھ کر چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے اور میں سب سننے پر مجبور تھا۔

لیکن پتا نہیں کیوں اس دن واپس گھر آ کر میں جب سونے کے لیے لیٹا تو مجھے چند گھنٹے پہلے کی یہ ساری آپ بیتی اتنی بری نہیں لگی۔ رابیل علی سے مرعوبیت اور بھی بڑھ گئی تھی کیونکہ اس دن پہلی بار میں نے اسے اردو اور انگلش میں بولتے بلکہ خوب بولتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے دونوں زبانوں میں یکساں مہارت تھی اور میں دونوں میں سے کسی پر بھی عبور نہیں رکھتا تھا۔

اس رات میں بہت دیر تک رابیل علی کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور زندگی میں پہلی بار میں نے کسی لڑکی کی ظاہری خوبصورتی کی بجائے اس کی ذہانت اور حاضر دماغی کے بارے میں سوچا تھا۔ اس وقت مجھے اس کے سوالوں کے بہت مناسب جواب سوجھ رہے تھے اور مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے کوئی بھی ایسا سوال نہیں کیا تھا جس کا جواب نہ دیا جاسکتا ہو لیکن اب اس کا فائدہ نہیں تھا کیونکہ جواب دینے کا وقت گزر چکا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا۔ جیسے میں اس کے لیے ایک ننھا بچہ تھا جسے وہ بہلا کر اپنی اور دوسروں کی انجوائے منٹ کا سامان کر رہی ہو۔

جب سے میں پاکستان کرکٹ ٹیم میں آیا تھا، یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے مجھے اتنی غیر سنجیدگی سے لیا تھا۔ یہ درست تھا کہ میں کافی کم عمر تھا لیکن بہرحال اپنے قد و قامت سے میں کسی طور بھی ٹین ایجر نہیں لگتا تھا اور نہ ہی مجھے یہ بات پسند تھی کہ مجھے ٹین ایجر کے طور پر ٹریٹ کیا جاتا۔

پتا نہیں کیا ہوا تھا مگر اس فنکشن کے بعد میں نے باقاعدہ طور پر کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ کلاسز میں کم ہی اٹینڈ کرتا ہاں انگلش ڈیپارٹمنٹ کا چکر ضرور لگایا کرتا تھا وجہ صرف رابیل علی تھی۔ وہاں اکثر میرا اس سے سامنا ہو جاتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ اس نے کبھی بھی مجھ سے سلام دعا میں پہل نہیں کی تھی۔ وہ اپنی دوستوں کے ساتھ ہوتی اور میں اپنے دوستوں کے ساتھ اور وہ اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈال کر گزر جانے کی کوشش کرتی اور میں ہمیشہ پہل کرتے ہوئے اس سے ہیلو ہائے کرتا۔ وہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا جواب دیتی اور میرے ساتھ مزید گفتگو کرنے کی بجائے پاس سے گزرتی چلی جاتی۔

شروع میں مجھے اس کے اس رویے سے عجیب سی خفت کا احساس ہوا تھا کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ مجھے لڑکیوں سے سلام دعا میں پہل کرنی پڑی ہو یا کسی نے اس طرح سرسری انداز میں میرے سلام دعا کا جواب دیا ہو، جیسے اہم شخص میں نہیں وہ ہو۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے وہ جان بوجھ کر ایسا کرتی تھی تاکہ میں یہ سمجھ کر کہ وہ بڑی منفرد لڑکی

ہے اس کی طرف مزید راغب ہوں اور اس کی محبت میں گرفتار ہو جاؤں۔

جب یہ خیال میرے دماغ میں آیا تو یک دم وہ مجھے بڑی تھرڈ کلاس لڑکی لگی جو مردوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے وہی اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہی تھی جو آج کل کی ہر لڑکی استعمال کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ کچھ اس میں کامیاب بھی ہو جاتی ہیں لیکن بیشتر ناکام رہتی ہیں کیونکہ آج کا مرد اتنا بھولا نہیں ہے جتنا لڑکیوں نے سمجھ لیا ہے۔ بے نیازی جتانے کا یہ حربہ مردوں کا بہت پرانا اور آزمودہ حربہ رہا تھا جسے وہ اب آؤٹ ڈیٹڈ سمجھ کر چھوڑ چکے ہیں اور لڑکیوں نے اسے اپنا لیا ہے۔ سو مجھے خود پر بڑا افسوس ہوا کہ میں کیسے اس حربے میں پھنس گیا ہوں اور ایک مجنوں کی طرح میں نے انگلش ڈیپارٹمنٹ جانا شروع کر دیا ہے۔

اگلے کچھ دن میں کالج جانے سے باز رہا لیکن پھر چند دن کے بعد پتا نہیں مجھے کیا سوجھی کہ میں نے پھر کالج جانا شروع کر دیا اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ انگلش ڈیپارٹمنٹ بھی، میں نے بہت کوشش کی کہ اسے نظر انداز کرنا شروع کر دوں بالکل ویسے ہی جیسے وہ مجھے کرتی ہے لیکن بس یہی ایک کام تھا جو میں نہیں کر پایا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے لیے مخالفانہ خیالات اور اس کے لیے میری کدورت بھک سے میرے دماغ سے غائب ہو گئی تھی۔ اپنی ساری انا، غیرت اور خودداری کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں نے اس کا حال پوچھا تھا اور وہ I'm fine کہہ کر جوابی طور پر میرا حال پوچھے بغیر چلی گئی تھی میری ساری محنت کا حصول وہ مسکراہٹ تھی جو چند لمحوں کے لیے مجھ سے بات کرتے ہوئے اس کے چہرے پر نمودار ہوئی تھی اور پھر یہ سب روٹین کا حصہ بن گیا تھا۔

اس پر نظر پڑتے ہی میں کسی سحر زدہ معمول کی طرح اس کی طرف بڑھ جاتا تھا اور ان ہی رسمی دعائیہ کلمات کے بعد وہ رکے بغیر چلی جاتی تھی اور مجھے اپنی اس حرکت پر بے حد طیش اور شرم محسوس ہوتی تھی لیکن صرف اس وقت تک جب تک وہ دوبارہ میرے سامنے نہیں آ جاتی تھی۔

پھر آہستہ آہستہ مجھے پتا چلا کہ صرف میں ہی نہیں تھا جو اس کے پروانوں میں شامل تھا وہاں ستم رسیدہ اور بھی تھے اور ان میں ہر عمر اور ہر ایئر کے نوجوان شامل تھے اور سب سے بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ میرا عزیز ترین دوست عمر زبیری بھی ان ہی لوگوں میں شامل تھا۔ مجھے ہمیشہ اس بات پر خوشی محسوس ہوتی تھی کہ میں جب بھی عمر سے انگلش ڈیپارٹمنٹ جانے کے لیے کہتا ہوں وہ ایک لفظ کہے بغیر اٹھ کھڑا ہو جاتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری دوستی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے مگر اس کا انکشاف بہت بعد میں ہوا کہ وہ اصل میں رابیل علی کو دیکھنے کے لیے وہاں جانے پر تیار ہو جاتا تھا۔ اگرچہ یہ اندازہ کبھی بھی نہیں ہو پایا کہ میں بھی اس کے رقیبوں میں شامل ہوں اور نہ ہی یہ انکشاف میں نے کرنے کی کوشش کی۔ یہ اسی کی بدولت تھا کہ مجھے ان دوسرے لڑکوں کے بارے میں پتا چلتا گیا جو رابیل علی کو دیکھنے کے لیے انگلش ڈیپارٹمنٹ جاتے تھے۔

عمر کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ انگلش ڈیپارٹمنٹ میں کون کس لیے جاتا تھا اور میری معلومات میں اضافہ کا وہ سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ یہ راز بھی مجھ پر آہستہ آہستہ ہی آشکار ہوا تھا کہ جس چیز کو میں رابیل علی کی چال یا حربہ سمجھ رہا ہوں وہ دراصل اس کی عادت تھی۔ میں وہ پہلا یا واحد آدمی نہیں تھا جسے وہ اگنور کرتی تھی وہ اپنے علاوہ ہر ایک کو ہی

اگنور کرتی تھی اس میں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ ہاں لڑکوں کی سلام دعا کو وہ صرف سلام دعا تک ہی محدود رکھتی تھی اور حال احوال جاننے یا پوچھنے کا تکلف تک نہیں کرتی تھی۔

اس کی ریپوٹیشن کالج میں ایسی تھی کہ اوّل تو کوئی اسے مخاطب کرنے کی جرأت ہی اپنے آپ میں پیدا نہیں کر پاتا تھا خاص طور پر وہ جو کالج صرف سیر و تفریح اور نظارے کرنے کے لیے آتے تھے۔ وہ خود اعتمادی سے مالا مال تھی، بہت ساروں کے پاس یہ خوبی ہوتی ہے۔ وہ اسٹریٹ فارورڈ تھی، بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ وہ بلا کی ذہین تھی، لاکھوں لوگ ذہین ہوتے ہیں۔ اس کی شخصیت خوبصورت تھی، یہ بھی کوئی ایسی خاص خوبی نہیں ہے۔ وہ بے داغ کردار کی مالک تھی، کم سہی مگر خوبصورت کردار کے بہت لوگ بھی اسی دنیا میں ملتے ہیں۔ مگر یہ ساری باتیں کسی ایک شخص میں بہت کم ملتی ہیں اور کسی عورت میں تو شاید بہت ہی کم، کالج میں اور بھی بہت سی لڑکیاں ایسی تھیں جن کے چرچے عام تھے، جن کے ہزاروں پروانے تھے اور انھیں دیکھنے کے لیے بھی لڑکے باقاعدہ انتظار کرتے تھے مگر وہ صرف ان لڑکیوں کی خوبصورتی کے پروانے تھے۔ کوئی کسی کے چہرے کی ایک جھلک دیکھنے کا منتظر رہتا اور کسی کو کسی اور کی فکر غضب کی لگتی یا کسی کے لباس پہننے کا انداز ایسا ہوتا کہ وہ دوسروں کو دعوت نظارہ دیتا رہتا لیکن میں نے کبھی کسی لڑکے کو کسی لڑکی کی شخصیت یا ذہانت سے اتنا متاثر نہیں دیکھا تھا کہ وہ اس کے لیے اس طرح بے قرار پھرے مگر رابیل علی ایسی لڑکی تھی جس کی جسمانی خوبصورتی کے لیے تو شاید کوئی اسے دیکھنے کے لیے کھڑا نہ ہوتا مگر ذہن یا شاید شخصیت یا شاید...... نہ جانے کیوں مجھے یہ بتانا اتنا مشکل کیوں ہو رہا ہے کہ اس میں کیا بات تھی جو دوسروں کو یوں سحر زدہ کر دیتی تھی۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ بہت مغرور تھی جب کوئی اس سے مخاطب ہوتا اس کا حال احوال دریافت کرتا یا اس سے کسی مسئلے پر مدد کا طلبگار ہوتا تو وہ بڑی سنجیدگی سے اس کی بات سنتی تھی۔ میں نے کبھی اس کے انداز میں دوسروں کے لیے ہتک نہیں دیکھی تھی، شاید وہ اپنے دوستوں کے علاوہ باقی سب کو ایک سے انداز میں ہی ٹریٹ کرنا چاہتی تھی اور یہ میرے لیے کچھ قابل قبول نہیں تھا۔ میں خاص توجہ اور غیر معمولی برتاؤ کا عادی ہو چکا تھا۔ مجھے یہ گوارہ کیسے ہوتا کہ وہ مجھے عام سا لڑکا سمجھے اسے احسن منصور اور دوسرے لڑکوں میں کوئی فرق ہی محسوس نہ ہو۔

میری بے چینی بجا تھی مگر شاید رابیل کو احسن منصور نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اسے تو شاید سیکنڈ ائیر کا ایک ننھا لڑکا نظر آتا تھا۔

ان ہی دنوں کرکٹ سیزن شروع ہو گیا تھا اور میری توجہ رابیل سے ہٹ گئی تھی۔ تقریباً چھ ماہ تک میں مختلف اندرونی و بیرونی دوروں میں مصروف رہا تھا اور ان چھ ماہ میں رابیل علی میرے ذہن سے یکسر محو ہو کر رہ گئی تھی۔ میری توجہ ان لڑکیوں پر مبذول رہی تھی جو میرے اردگرد رہتی تھیں اور ان پریوں کی موجودگی میں مجھے رابیل علی بالکل یاد نہیں آئی۔

یہ چھ ماہ میرے لیے اور عروج لے کر آئے تھے۔ میں نے کاؤنٹی کرکٹ کھیلنے کا معاہدہ بھی کر لیا تھا اور چند دوسرے اسپورٹس وئیر کے اداروں کے ساتھ بھی میں نے کانٹریکٹ کیے تھے اور دولت اب مجھ پر بارش کی طرح برس رہی تھی۔

چھ ماہ تک کرکٹ میں مصروف رہنے کے بعد میں سیزن ختم ہوتے ہی کالج آیا تھا اور آتے ہی مجھے رابیل بھی یاد آ گئی تھی۔ اس بار میں اپنی ذاتی ہنڈا سوک پر کالج آیا تھا اور میں جانتا تھا کہ کالج میں میرا استقبال بھی پہلے سے زیادہ پُرجوش طریقے سے ہوگا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ مجھے اس سیزن میں میری بہترین پرفارمنس پر بے تحاشا داد اور مبارکبادیں دی گئی تھیں اور ہر تعریفی کلمے پر میرا سر فخر سے اور بلند ہو جاتا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ رابیل مجھ سے سامنا ہونے پر رسماً ہی سہی مگر مجھے مبارکباد ضرور دے گی کیونکہ پچھلے چھ ماہ سے میں جو کارنامے دکھاتا پھر رہا تھا اس پر یقیناً داد کا مستحق تھا۔ میں جہاں سے گزرتا ہر ایک کی توجہ کا مرکز بنتا ہوا انگلش ڈیپارٹمنٹ پہنچ گیا۔

اس دن عمر میرے ساتھ نہیں تھا اور اس کے بجائے میرے دوسرے دوست میرے ساتھ تھے۔ میں نے اسے چند لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھے دیکھا۔ وہ سب کسی بحث میں مصروف تھے۔ میں دانستہ طور پر اس کے پاس رکا۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے دوسرے لڑکوں نے مجھے کافی خوش دلی سے گریٹ کیا تھا اور مجھے میری پرفارمنس پر مبارکباد دی تھی لیکن اس نے صرف میرے سلام کا جواب دیا تھا اور پھر مسکراتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہونے والی میری گفتگو سنتی اور دیکھتی رہی۔

ایک دفعہ بھی اس کے لبوں سے میرے لیے کوئی تعریفی کلمہ نہیں نکلا تھا۔ میں اس کے بولنے کا منتظر تھا اور وہ شاید میرے جانے کے انتظار میں تھی پھر میں وہاں سے آ ہی گیا تھا۔ ایک عجیب سی ہتک کا احساس ہوا تھا مجھے اس دن اور پتا نہیں کیوں ساری رات میں سو نہیں پایا۔ سگریٹ پر سگریٹ سلگاتے کمرے کے چکر لگاتے ہوئے میں نے ساری رات گزار دی۔

صبح میں فجر کی اذان کے بعد سویا تھا اسی لیے جاگنگ کے لیے بھی نہیں جا پایا، نہ ہی کوئی دوسری ایکسر سائز کرنے کو میرا دل چاہا۔ امی نے دس بجے ناشتے کی میز پر میری آنکھیں سرخ دیکھ کر مجھ سے وجہ پوچھی تھی اور میں بڑی صفائی سے انھیں ٹال گیا تھا۔

رابیل علی کے بارے میں سب کچھ جاننے کی بے چینی میرے سر پر سوار تھی۔ میں اس کے ماضی، حال، ہر چیز کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ شاید کوئی ایسا رخنہ ایسی دراڑ مجھے ملے جس سے میں اس کے قلعے کو توڑ سکوں۔ وہ جو اس قدر پُرسکون اور ناقابل تسخیر نظر آتی ہے کہیں تو کچھ ایسا ہوگا جس سے اس کی مضبوطی اور سکون کو ختم کیا جا سکے گا اور اگلے چند ہفتوں میں، میں اس کے بارے میں سب کچھ معلوم کر چکا تھا اور ایک عجیب سی مایوسی مجھے ہوئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ وہ کسی بہت امیر و کبیر فیملی سے تعلق رکھتی ہے اور شاید اس کے اعتماد کی وجہ بھی یہی ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ وہ ایک مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی ماں ایک گورنمنٹ اسکول میں ہیڈ مسٹریس تھی جو سترہ سال پہلے اپنے شوہر سے طلاق لے چکی تھی۔ رابیل کی دو اور بہنیں تھیں اور وہ دونوں بھی اس کی طرح قابل تھیں۔ اس کی چھوٹی بہن معصومہ علی نے گورنمنٹ کالج سے گریجویشن کیا تھا اور پھر اس نے لندن اسکول آف اکنامکس کا ایک اسکالرشپ حاصل کیا تھا اور اس وقت وہ انگلینڈ میں زیر تعلیم تھی اور اس کی سب سے چھوٹی بہن ملیحہ علی، کے۔ ای میڈیکل کالج میں تھی۔ وہ جس علاقے میں رہائش پذیر تھے وہ مڈل اور لوئر مڈل کلاس

لوگوں کا علاقہ سمجھا جاتا تھا اور وہ ایک پرانی طرز کے پانچ مرلے پر بنے ہوئے گھر میں مقیم تھے۔
تعلیمی قابلیت کے علاوہ کوئی اور خاص خصوصیت ان کے گھر میں نہیں پائی جاتی تھی اور مجھے یہ سب کچھ جان کر یک گونہ سکون بھی ہوا تھا کہ میں مالی اعتبار سے اس سے بہت برتر ہوں اور اس کی بے رخی کی وجہ کم از کم اس کی دولت نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ دولت نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہیں تھی۔

اور نہ جانے کیوں میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ میں دولت کے ذریعے اس کو امپریس کر سکتا ہوں اسی لیے میں نے اس کے لیے ایک بہت قیمتی گھڑی خریدی تھی۔ لیکن اب میرے لیے مسئلہ یہ تھا کہ اسے یہ گھڑی کیا کہہ کر دی جائے۔ میں نے تمام ممکنہ بہانوں کو سوچا تھا اور پھر برتھ ڈے گفٹ کا بہانہ مجھے بھا گیا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ کالج کے ایڈمیشن فارم میں اس کی جو ڈیٹ آف برتھ لکھی تھی۔ اس کے مطابق اس کی سالگرہ کو گزرے تقریباً ایک مہینہ ہو چکا تھا لیکن مجھے اس سے کوئی مایوسی نہیں ہوئی کیونکہ میرے نزدیک یہ کوئی زیادہ عرصہ نہیں تھا۔

سو ایک دن میں ایک خوبصورت کارڈ اور گفٹ پیک کے ساتھ دوبارہ انگلش ڈیپارٹمنٹ پہنچ گیا تھا۔ اس دن وہ مجھے برآمدے میں ایک بہت خوبصورت اور دراز قد لڑکے کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی ملی۔ وہ لڑکا بڑی سنجیدگی سے اسے کچھ بتا رہا تھا اور وہ بالکل خاموش کھڑی اس کی بات سن رہی تھی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کس طرح اس سے بات شروع کروں۔ برآمدے میں اس وقت بہت کم لوگ تھے اور جو تھے وہ مجھ پر نظریں جمائے ہوئے کھڑے تھے۔
میں آہستہ آہستہ رابیل کے پاس پہنچ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ میری طرف متوجہ ہوتی اس لڑکے کی نظر مجھ پر پڑی تھی۔
وہ بولتے بولتے رک گیا شاید وہ میری آمد کا مقصد سمجھنا چاہ رہا تھا۔ مجھے اس کے چہرے پر واضح طور پر حیرانگی نظر آئی۔
رابیل نے اس لڑکے کے خاموش ہو جانے پر اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے مڑ کر دیکھا تھا اور مجھے دیکھتے ہی ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی تھی اور زندگی میں پہلی دفعہ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے میرا حال احوال پوچھا تھا مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں ساتویں آسمان پر پہنچ گیا ہوں پھر اس نے اس لڑکے سے بھی میرا تعارف کروایا تھا وہ ضیغم حیدر تھا اور رابیل کا کلاس فیلو تھا میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور اس نے مسکراتے ہوئے بڑی شستہ انگریزی میں مجھ سے کہا:

''تو آپ وہ ستارے ہیں جنھوں نے آج کل کرکٹ کی دنیا کے باقی سب ستاروں کو دھندلایا ہوا ہے۔''
میں اس کے تبصرے پر کچھ کہہ ہی نہیں پایا۔ اتنی روانی سے میں اسے انگلش میں جواب نہیں دے سکتا تھا اور اردو میں کچھ کہنا مجھے مناسب نہیں لگا سو میں صرف تھینک یو کہہ پایا۔
''رابیل مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''
''میں نے فوراً ہی رابیل سے کہا تھا اور اس کا جواب میرے لیے چکرانے والا تھا۔
''کیجیے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کندھے اچکا کر کہا تھا۔
میں نے ایک نظر ضیغم حیدر کو دیکھا جو بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔
''میں اصل میں علیحدگی میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ رابیل میری بات کے جواب میں کچھ کہتی ضیغم بول اٹھا تھا:

''معاف کیجئے گا میرا خیال ہے مجھے اب چلا جانا چاہیے پھر ملاقات ہوگی۔''

وہ یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔

''جی فرمائیں آپ کو کیا کہنا ہے؟'' مجھے پہلی بار رابیل کے چہرے پر الجھن نظر آئی تھی۔

''اصل میں، میں آپ کو یہ دینا چاہتا تھا۔'' میں نے جھجکتے ہوئے پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا تھا لیکن اس نے ہاتھ بڑھائے بغیر مجھ سے پوچھا:

''یہ کیا ہے؟''

''یہ آپ کی سالگرہ کا تحفہ ہے۔''

وہ میری بات پر جیسے حیران رہ گئی تھی۔

''یہ بس ایک گھڑی ہے۔'' میں نے مزید وضاحت کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس وقت تک شاید حیرت کے اس جھٹکے پر قابو پا چکی تھی اس نے اپنی بائیں کلائی میرے چہرے کے سامنے کی تھی۔

''یہ جو چیز میری کلائی پر بندھی ہے اسے بھی گھڑی ہی کہتے ہیں اور اگر یہ میری کلائی پر بندھی ہے تو سیدھے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ میری ملکیت ہے اور اگر یہ میری ہے تو ظاہر ہے مجھے مزید کسی گھڑی کی ضرورت نہیں ہے، یہ تھی پہلی بات، دوسری بات یہ ہے کہ میری سالگرہ کو گزرے بہت دن ہو چکے ہیں اس لیے کسی تحفے کی کوئی تک نہیں بنتی، تیسری بات یہ کہ میرے اور آپ کے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہیں جو آپ کو یہ تحفہ دینے اور مجھے لینے پر مجبور کرے اور اب ایک سوال، آخر آپ کو میری ڈیٹ آف برتھ کا پتا کیسے چلا ہے؟ جواب میں ہی دے دیتی ہوں میرا خیال ہے آپ نے آفس سے معلوم کروایا ہوگا لیکن کیوں؟''

اس کے لہجے میں اب میرے لیے سرد مہری تھی چہرے پر اس مسکراہٹ کا نام و نشان بھی نہیں تھا جو پہلے ہوتی تھی۔ میں بے حد نروس ہو چکا تھا۔ اسے اتنا غصہ آئے گا یہ میری توقع کے برخلاف تھا۔ میں تو یہ تصور کر رہا تھا کہ وہ اس سرپرائز پر حیران ہوگی اور شاید خوش بھی کہ مجھے اس کی برتھ ڈے کا علم ہے۔ دیر سے ہی سہی لیکن اسے ایک عدد تحفہ بھی دے رہا ہوں، یہ ایک ایسا اعزاز تھا کہ شاید کالج کی کسی اور لڑکی کو ملتا تو وہ خوشی سے مر ہی جاتی۔ مگر وہ سراپا سوال بنی میرے سامنے کھڑی تھی۔ اپنی ڈارک بلیک آنکھیں میرے چہرے پر جمائے وہ بڑی تیکھی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ جن میں مروت اور لحاظ نام کو بھی نہیں تھا۔

میں نے ہولے سے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا اور پھر اس سے مخاطب ہوا:

''اصل میں، میں آفس میں کسی کام سے گیا تھا تو وہاں بائی چانس آپ کا ایڈمیشن فارم دیکھ لیا اسی میں آپ کی ڈیٹ آف برتھ تھی۔ میرے کچھ دوستوں کی ڈیٹ آف برتھ بھی یہی ہے اسی لیے مجھے یہ بہت مانوس سی لگی۔''

مجھے اپنا بہانہ موزوں لگا تھا لیکن اس کے تاثرات ویسے ہی تھے۔

''آل رائٹ، چلیں اس بار میں آپ کے جھوٹ کو سچ مان لیتی ہوں بٹ نیور ڈو اٹ اگین۔'' اس نے مجھے

جیسے تنبیہہ کی تھی۔ یقیناً میری وضاحت پر اسے اعتبار نہیں آیا تھا۔

''دیکھیں میں یہ گفٹ آپ کو کسی غلط نیت سے نہیں دے رہا، میں اصل میں آپ سے بہت امپریس ہوں اور......'' اس نے میری بات درمیان میں ہی کاٹ دی تھی:

''Let me make one thing very clear یہاں کالج میں ہم اور آپ امپریس ہونے کے لیے نہیں آتے، یہاں ہم پڑھنے کے لیے آتے ہیں اور اگر بقول آپ کے آپ مجھ سے امپریس ہو بھی گئے تھے تو کیا یہ ضروری تھا کہ آپ بھی مجھے امپریس کرنے کی یہ گھٹیا سی کوشش کرتے اور جہاں تک آپ کی نیت کا تعلق ہے تو مجھے اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ آپ کی نیت غلط تھی یا صحیح۔''

وہ اپنی بات کہہ کر جانے لگی تھی جب میں نے اسے پھر روکا تھا۔

''دیکھیں رابیل آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں۔''

اس نے جاتے جاتے مڑ کر بڑے مستحکم اور سرد مہر لہجے میں کہا تھا:

''صحیح نہ غلط میں آپ کو کچھ بھی نہیں سمجھ رہی ہوں کیونکہ میرے پاس اتنا فالتو وقت ہی نہیں ہے جسے میں لوگوں کو سمجھنے پر ضائع کرتی پھروں۔ آپ میرے لیے اس کالج کے ہزاروں اسٹوڈنٹس میں سے ایک ہیں جن میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ سو آئی ہوپ کہ اگر آپ کو میرے بارے میں کوئی خوش فہمی یا غلط فہمی ہو گئی ہے تو آپ اسے دور کر لیں گے۔''

وہ یہ کہہ کر وہاں سے چلی گئی تھی اور مجھے یوں لگا تھا جیسے اس نے میرے چہرے پر جوتا کھینچ مارا ہو۔ میں خود کو ایک بہت بڑی ہستی سمجھ کر وہاں آیا تھا۔ مگر اس نے شاید مجھے میرا اصلی چہرہ دکھا دیا تھا میں وہاں سے تقریباً بھاگتا ہوا گھر آیا تھا پھر میں بہت دنوں تک کالج جانے کی ہمت نہیں کر پایا اور کئی روز تک میں اپنے حواس میں نہیں رہا۔ وہ کیا تھی جو اس طرح میری تذلیل کرتی؟ اسے احسن منصور اور دوسرے لڑکوں میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آیا۔

ٹھیک ہے وہ بہت قابل اور ذہین تھی لیکن ایسی ذہانت والی سینکڑوں لڑکیاں مجھ پر مرتی تھیں۔ ٹھیک ہے اگر اس کے چاہنے والے بہت تھے تو مجھ پر مرنے والوں کی تعداد ان سے بہت زیادہ تھی۔ وہ تو صرف اس کالج میں جانی جاتی تھی اور مجھے دنیا میں پہچانا جاتا تھا پھر بھی اس نے کہا تھا کہ اسے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ایک آگ سی تھی جو میرے اندر بھڑک گئی تھی، شاید نوجوانی کا جوش اور غصہ تھا یا شاید تذلیل کا احساس، بہت دنوں تک اندر ہی اندر سلگنے کے بعد میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔

میں نے دو ہفتے کے بعد اس کے ڈیپارٹمنٹ جا کر اپنی غلطی مانتے ہوئے اس سے معافی مانگی تھی اور اس نے کمال بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے معاف کر دیا تھا۔ پھر چند ہفتوں کے بعد میں کاؤنٹی کھیلنے کے لیے انگلینڈ چلا گیا اور یہاں چھ ماہ کے قیام نے میری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ پہلی دفعہ میں اتنے دنوں تک اپنے والدین سے اکیلا دور کسی ایسی جگہ پر تھا جہاں ہر قسم کی آزادی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں کسی سیلن زدہ کمرے سے کسی کھلی چراگاہ میں آ گیا ہوں۔ اس سے پہلے ٹیم کے ساتھ میں دورے کرتا رہا تھا لیکن ٹیم کے ساتھ رہتے ہوئے

بہت سی پابندیاں تھیں جن کا مجھے سامنا کرنا پڑتا تھا لیکن کاؤنٹی کے لیے کھیلتے ہوئے ویسی کوئی پابندی مجھ پر نہیں لگائی گئی تھی۔

میں کم عمر تھا۔ خوبصورت تھا، لائم لائٹ میں تھا اور بے تحاشا دولت میرے پاس تھی۔

یہیں ایلسی کے ساتھ میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے سوفٹ ڈرنک بنانے والے ایک ادارے کے ساتھ ایک کمرشل کا کانٹریکٹ کیا تھا اور اس کمرشل میں میرے ساتھ ایلسی براؤنز نے کام کرنا تھا۔ اس کا شمار اوسط درجے کی ماڈلز میں ہوتا تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں مجھے وہ اس قدر اچھی لگی؟ شاید اس کی بے باکی مجھے پسند آئی تھی۔ شاید میں پہلی بار کسی مغربی لڑکی کو اتنے قریب سے جان رہا تھا۔ کمرشل کی شوٹنگ کا آغاز ہونے سے پہلے ایک ڈنر میں اس سے میرا تعارف کروایا گیا تھا اور پہلی ہی ملاقات میں اس نے میرے لیے واضح پسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا۔ میں اس کے تعریفی کلمات پر خوشی سے پھولا نہ سمایا تھا۔

بہر حال پہلی دفعہ کوئی مغربی ماڈل گرل میرے لیے اس قسم کے جذبات کا اظہار کر رہی تھی اور پھر اس کے ساتھ میری بے تکلفی بڑھتی چلی گئی۔ اسے کوئی حجاب نہیں تھا اور میں عاشق مزاج تھا۔ ایک رات میں نے اسے اپنے فلیٹ میں ڈنر پر مدعو کیا اور وہ آ گئی تھی۔ ڈنر کے بعد اس نے میرے ساتھ رقص کرنے کی خواہش کا اظہار کیا اور اندھا کیا چاہے دو آنکھیں کے مصداق میں فوراً اس پر تیار ہو گیا۔ رقص کے دوران اس نے میری کسی پیش قدمی کا برا نہیں مانا بلکہ مجھے ایسا لگا جیسے وہ خود اسی کے انتظار میں تھی۔ وہ اپنی اداؤں سے میرے جذبات کو اور بھڑکاتی رہی اور پھر اس ملاقات کا اختتام ویسے ہی ہوا تھا جیسے مغرب میں ہوا کرتا ہے۔

وہ عمر میں مجھ سے دس سال بڑی تھی اور میں صرف انیس سال کا تھا۔ یقیناً میں اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد نہیں تھا لیکن وہ جسمانی طور پر میری زندگی میں آنے والی پہلی عورت تھی۔ یہ تعلق محبت کا نہیں صرف ضرورت کا تھا۔ اخلاقی طور پر تباہی کی جس آخری سیڑھی سے گرنے کے لیے مجھے جو الٹا قدم اٹھانا تھا وہ میں اٹھا چکا تھا۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو ایلسی میرے بیڈ میں ابھی سو رہی تھی۔ یک دم مجھے اس سے اور اپنے کمرے سے بے تحاشا خوف محسوس ہوا۔ میں نائٹ گاؤن پہن کر کمرے سے باہر آ گیا۔ صوفے پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے میں پچھلی رات کے واقعات کو یاد کرنے لگا اور ایک عجیب سی ندامت مجھے محسوس ہوئی تھی۔ اپنے پہلے غیر ملکی ٹور سے لے کر انگلینڈ آنے تک ایک بار بھی ایسا موقع نہیں آیا تھا جب میرے والدین یا بھائیوں نے مجھے ان چیزوں سے بچنے کے لیے کوئی نصیحت کی ہو۔ وہ سب ہمیشہ اس بات پر ہی نازاں رہے تھے کہ میں کرکٹ ٹیم میں شامل ہو کر باہر جا رہا ہوں اور اس بار بھی انگلینڈ آتے ہوئے وہ بہت خوش تھے کیونکہ انگلینڈ کا یہ ٹور مجھے مالی طور پر بہت مستحکم کر دیتا۔ کسی نے ایک دفعہ بھی مجھے نہیں کہا کہ میں ایسے کوئی غلط کام کرنے کی کوشش نہ کروں شاید وہ سمجھتے تھے کہ میں ایسا کچھ کر ہی نہیں سکتا یا شاید ان کا دھیان ہی اس طرف نہیں گیا یا پھر انھوں نے یہ سوچا تھا کہ مجھے کسی نصیحت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

لیکن اس دن ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر میں نے جانا تھا کہ ایسی کی گئی کوئی نصیحت شاید میرے بہت کام آتی

جو پچھتاوا مجھے صبح ہو رہا تھا وہ اس حرکت کو کرنے سے پہلے ہی ہو جاتا لیکن میری یہ کیفیت بہت زیادہ دیر تک نہیں رہی تھی۔

ایلسی کے بیدار ہوتے ہی یک دم یہ افسردگی دور ہوگئی تھی۔ میں نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دے لی تھی کہ یہ سب ہو ہی جاتا ہے اس دور میں۔ یہ سب کرنے والا میں دنیا کا واحد مرد تو نہیں ہوں نہ ہی کرکٹ ٹیم میں اکلوتا ہوں، ٹیم کے باقی کھلاڑی بھی ایسی حرکات میں ملوث ہوتے رہے ہیں پھر مجھے افسردہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ آخر میں مرد ہوں۔ دوسری ضروریات کے ساتھ یہ بھی میری ایک ضرورت تھی جسے میں نے پورا کرلیا تو کیا برا کیا؟

اور میں واقعی ان فریبوں سے بہل گیا تھا۔ میں ایک ہی رات میں ٹین ایج سے نکل کر ''باشعور'' لوگوں میں شامل ہو گیا تھا اور پھر یہ سب میری زندگی کی روٹین میں شامل ہو گیا تھا۔ ایلسی کافی عرصہ تک میرے ساتھ رہی مگر وہ میری زندگی میں آنے والی اکلوتی لڑکی نہیں رہی۔

ان چھ ماہ میں بہت سی لڑکیوں کے ساتھ میرے تعلقات کا آغاز ہوا۔ میں اس ماحول میں مکمل طور پر ایڈجسٹ ہو گیا تھا اور میں یہ بھی جان چکا تھا کہ اس سوسائٹی میں کسی لڑکی کے ساتھ کسی بھی قسم کے تعلقات رکھنا یا رکھنے کی خواہش کا اظہار کرنا معیوب بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ لہٰذا جن لڑکیوں کے ساتھ بھی میری جان پہچان ہوتی میں چند ہی ملاقاتوں کے بعد بڑی بے باکی کے ساتھ ان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیا کرتا تھا۔ چند دفعہ مجھے بڑے مہذب طریقہ سے انکار کر دیا گیا لیکن زیادہ تر میری اس خواہش یا مطالبہ کو مان لیا جاتا۔

پھر بہت سی لڑکیوں کے ساتھ میری دوستی رہی، ان میں برٹش بھی تھیں اور پاکستانی بھی جو انگلینڈ میں مقیم تھیں اور ہر ایک کے ساتھ میری دوستی آخری حد کو پار ضرور کرتی رہی۔ لیکن پتا نہیں میرا دل کسی ایک لڑکی پر کیوں نہیں ٹھہرتا تھا۔ میں بہت جلد ایک لڑکی کی قربت سے اکتاتا اور دوسری لڑکی تلاش کرنا شروع کر دیتا۔ ان دنوں میں مجھے رابیل علی قطعاً یاد نہیں آئی اور اگر کبھی یاد آئی بھی تو مجھے ہنسی آتی کہ میں کس قسم کا رومانس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میرے لیے رابیل علی کا چارم ختم ہو چکا تھا اور وہاں رہنے کی وجہ سے اس کی اچھی انگلش کا اثر بھی زائل ہو گیا تھا اب میرے لیے بھی وہ بس کالج کی ایک لڑکی تھی اور بس، میں فیصلہ کر چکا تھا کہ گریجویشن نہیں کروں گا کیونکہ اب مجھے اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ چھ ماہ بعد انگلینڈ سے واپس آنے والا احسن منصور اب پہلے جیسا احسن منصور نہیں رہا تھا اس کا اندر اور باہر یکسر طور پر بدل چکا تھا۔ میں ذہنی طور پر بہت میچور ہو چکا تھا اور شاید مضبوط بھی۔

جب میں نے زبیری کو کالج چھوڑنے کے فیصلے کے بارے میں بتایا تو اس نے میرے اس فیصلہ کو ناپسند کیا تھا۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ پڑھنا نہیں تو نہ سہی چند دن انجوائے منٹ کے لیے ہی آ جایا کروں اور انجوائے منٹ کے لفظ نے مجھے اس کی بات ماننے پر مجبور کر دیا۔

کالج میں واقعی فنکشنز کا آغاز ہونے والا تھا جس سے اچھی خاصی تفریح ہو جاتی سو میں نے اس کی بات مان لی تھی۔ عمر زبیری سے ہی مجھے پتا چلا تھا کہ رابیل علی نے ایم اے انگلش پارٹ ون کے امتحان میں کالج میں ٹاپ کیا تھا لیکن مجھے اس پر زیادہ حیرت نہیں ہوئی شاید وہ نہ کرتی تو حیرت ہوتی۔

انگلینڈ میں چھ ماہ رہنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اب میری دلچسپی رابیل میں ختم ہوگئی تھی سو مجھ پر اس خبر کا خاص اثر نہیں ہوا لیکن میں غلط تھا۔ اس دن میں عمر کے ساتھ کالج گیا تھا اور میں نے انگلش ڈیپارٹمنٹ جانے کی قطعاً کوشش نہیں کی لیکن اس دن سب اتفاقات سے بڑا اتفاق ہوا تھا۔ کالج سے واپس گھر جاتے ہوئے وہ مجھے سڑک کے کنارے دکھائی دی تھی۔

اور میں جو اسے ایک عام سی لڑکی سمجھنے کا تہیہ کر چکا تھا پتا نہیں کس طرح بے قابو ہوا اور میں نے گاڑی بالکل اس کے قریب جا کر روک دی وہ چند لمحوں کے لیے ٹھٹھک کر رک گئی تھی لیکن پھر میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی تیوری پر بل پڑ گئے تھے اور پتا نہیں کیوں لیکن مجھے اس کا یہ انداز اچھا لگا۔ بہت عرصے بعد کسی لڑکی نے مجھے دیکھ کر یوں بیزاری کا اظہار کیا تھا ورنہ تو میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی لڑکیاں شہد کی مکھی کی طرح میری طرف کھنچی چلی آتی تھیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہوئی تھی کہ تیوری پر بل ڈالنے کے باوجود وہ میری طرف بڑے بے دھڑک انداز میں آئی تھی۔

''ہاں جی کیا مسئلہ ہے آپ کو؟''

اس نے میرے قریب آتے ہی بڑے تیکھے انداز سے سوال کیا تھا۔ میں نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی جواب دیا تھا:

''مسئلہ تو شاید آپ کو درپیش ہے میں تو آپ کو دیکھ کر رک گیا تھا کہ شاید آپ کو لفٹ کی ضرورت۔''

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے پہلے سے بھی زیادہ ترش لہجے میں کہا:

''کیا میں نے آپ سے لفٹ مانگی تھی جو آپ اس طرح اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں؟''

مجھے یک دم ایسا لگا جیسے وہ پہلے ہی کسی بات پر غصہ میں تھی اور میں خوامخواہ اس کے عتاب کا نشانہ بن رہا ہوں اسی لیے میں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے مزید وضاحت کی:

''آپ پیدل جا رہی تھیں تو اس لیے میں نے گاڑی روک دی تا کہ آپ کو گھر پہنچا دوں۔''

''جسٹ ٹیل می ون تھِنگ کیا اس کالج کی ہر پیدل جانے والی لڑکی کو آپ گھر پہنچاتے ہیں؟ اور اگر ایسا کرتے بھی ہیں تو برائے مہربانی اپنی نوازش اپنے پاس رکھیں، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے اور آئندہ بھی اس طرح میرے پاس گاڑی لا کر مت کھڑی کرنا۔''

بڑے اکھڑ لہجے میں کہتے ہوئے وہ گاڑی کے پاس سے ہٹنا چاہ رہی تھی جب میں نے اس سے اچانک کہا:

''ہر کسی کے لیے تو گاڑی نہیں روکی جاتی یہ تو کچھ خاص لوگوں کے لیے روکی جاتی ہے جیسے میرے لیے تم خاص ہو۔''

آپ سے تم پر آنے میں مجھے ایک لمحہ لگا تھا اور وہ ایک عجیب شاکڈ حالت میں میرے سامنے کھڑی تھی شاید وہ مجھ سے ایسے کسی جملے کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

''پھر تم نے ایگزام میں ٹاپ کیا تھا، اس کی مبارکباد بھی تمھیں ملنی چاہیے تھی سو میں نے سوچا.....'' اس نے بڑے غضبناک انداز میں میری بات کاٹ دی تھی۔

''تم سوچا مت کرو کیونکہ تم یہ کام کرنے کے قابل نہیں ہو۔ سوچنے کے لیے دماغ چاہیے اور تمہارا دماغ کرکٹ خراب کر چکی ہے۔''

''تم مجھے......'' میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے تنبیہی انداز میں انگلی میری طرف کرتے بڑے زور سے کہا تھا:

''اپنا منہ بند رکھو اور میری بات سنو، ذرا اپنی عمر دیکھو اور اپنی حرکتیں دیکھو، ہے کیا تم میں جو اس قسم کی فضول بکواس کر رہے ہو۔ تم سے چار سال سینئر ہوں میں، تمھیں تو مجھ سے اس قسم کی بے ہودہ بات کرنے سے پہلے ڈوب کر مر جانا چاہیے۔ تمھیں گھر میں کوئی روک ٹوک کرنے والا کوئی سمجھانے والا نہیں ہے، تمھیں اس طرح کھلا چھوڑا ہوا ہے کیسا خاندان ہے تمہارا؟ جاؤ جا کر گھر والوں سے کہو کہ تمھیں لگام ڈال کر رکھیں۔ لوگوں کے لیے عذاب بنا کر چھوڑ دیتے ہیں۔''

وہ یہ کہہ کر بڑی تیزی سے وہاں سے چلی گئی تھی اور میں اسٹیرنگ وہیل پر ہاتھ جمائے دانت بھینچے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ مجھ میں ایسی کون سی خامی تھی جو اسے مجھ سے یوں متنفر کر رہی تھی۔ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں گونج رہا تھا۔ گھر آ کر بھی میں بہت زیادہ ڈسٹرب رہا تھا وہ جو ایک خوش فہمی تھی کہ اب مجھے اس میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوگی۔ وہ ختم ہو گئی تھی میں جان چکا تھا کہ وہ اب بھی میرے لیے اتنی ہی اہم ہے جتنی پہلے تھی اور پہلی دفعہ میں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔

اس بے عزتی کے بعد مجھے اس سے قطعاً نفرت محسوس نہیں ہوئی حالانکہ ہونی چاہیے تھی لیکن مجھے تو اس پر غصہ تک نہیں آیا۔ میں اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں کوئی اور قدم اٹھاتا مجھے ٹیم کے ساتھ دورے پر جانا پڑا۔

بیرونی دورے سے واپسی پر ہوم سیزن شروع ہو گیا اور جب میں ان سب سے فارغ ہوا تو اس وقت وہ کالج سے فری ہو چکی تھی۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ میرے پاس اس کا ایڈریس ہے اس لیے میں کبھی بھی اس سے رابطہ کر سکتا ہوں۔ سو اسی اطمینان کے ساتھ میں انگلینڈ چلا گیا تھا کافی ماہ وہاں گزارنے کے بعد میں واپس پاکستان آیا تھا اور یہاں پھر ایک غیر ملکی ٹیم کے خلاف سیریز کے لیے میرا انتخاب کر لیا گیا تھا سو میں چاہتے ہوئے بھی فوری طور پر اس سے رابطہ نہیں کر پایا۔

اور پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ اس کا خیال میرے ذہن سے محو ہو گیا۔ مجھے دوبارہ اس کا خیال اس وقت آیا تھا جب چند ماہ بعد ایک دن اخبار میں ایم اے انگلش پارٹ ٹو میں ٹاپ کرنے والی طالبہ کے طور پر میں نے اس کی تصویر دیکھی اور تصویر دیکھنے کے ساتھ ہی یک دم مجھے اس سے وابستہ سارے واقعات یاد آنے لگے اور بے اختیار سا ہو کر میں نے اس کا ٹیلی فون نمبر تلاش کیا اور پھر اسے فون کیا تھا۔ لیکن یہ جان کر مجھے شاک لگا تھا کہ وہ وہاں سے جا چکے ہیں اور اب وہاں اس مکان کے نئے مالک تھے۔

چند لمحوں کے لیے تو مجھے ایسا لگا جیسے میری سانس ہی بند ہو گئی ہو۔ اپنے اوسان بحال کرتے ہوئے میں نے

اس مکان کے نئے مالک سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے اس کے بارے میں کوئی اطلاع دیں اگر وہ جانتے ہوں لیکن انھوں نے مجھے یہ بتا کر اور مایوس کر دیا تھا کہ انھوں نے وہ مکان کسی پراپرٹی ڈیلر سے خریدا تھا اس لیے وہ اس مکان کے پرانے مالکوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ مجھے بہت شاک پہنچا تھا لیکن شاک سے زیادہ مایوسی ہوئی تھی آخر میں اس سے رابطہ کیسے کرتا؟

چند ہفتے میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرتا رہا لیکن میرا پرابلم یہ تھا کہ میں اپنے نزدیکی دوستوں کو اس کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا اور جن لوگوں کے ذریعے میں اس کا اتا پتا معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا وہ اس کے بارے میں زیادہ باعلم نہیں تھے۔ چند ہفتوں کی بھاگ دوڑ کے بعد بھی ناکامی ہونے کی وجہ سے میں نے اپنی کوششیں ترک کر دیں لیکن رابیل علی میرے ذہن سے محو نہیں ہوئی۔

پھر چار سال گزر گئے۔ ان چار سالوں میں بہت کچھ بدل گیا۔ پہلے میں پاکستان کے ٹاپ باؤلرز میں تھا۔ چار سالوں میں بین الاقوامی طور پر میرا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ پہلے میں صرف باؤلر تھا پھر میں نے بیٹنگ میں بھی اپنا لوہا منوا لیا۔ ایک دنیا میرے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ میرے پاس صرف روپیہ نہیں بے شمار روپیہ تھا۔ پھر مادی لحاظ سے میں جتنا اوپر گیا تھا اخلاقی لحاظ سے اتنا ہی نیچے گر گیا تھا۔

پہلے میرے افیئر ز چھپتے رہتے تھے لیکن اب میرے افیئر ز صرف اندرون ملک ہی نہیں بلکہ بیرون ملک بھی مشہور تھے لیکن اس کے باوجود میری شہرت اور میرے چاہنے والوں کی تعداد میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی نہ ہی میرے خاندان نے کبھی میرے کسی افیئر پر اعتراض کیا تھا۔ میں ان کے سامنے اپنے ہر اسکینڈل کو بوگس قرار دیتا اور وہ اس پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتے اور یقین کرتے بھی کیوں نہیں آخر یہ میں ہی تھا جس کی وجہ سے وہ ایک عام سے علاقے کے عام سے گھر سے اٹھ کر شہر کے سب سے پوش علاقے کے ایک دس کنال کے مکان میں مقیم تھے۔ میری وجہ سے ہی اب اُس گھر کے ہر فرد کے پاس اپنی ذاتی گاڑی موجود تھی۔ میرے بھائیوں نے میرے روپے کی مدد سے اپنا ذاتی امپورٹ ایکسپورٹ کا کام شروع کر دیا، سو انہیں میرے کسی فعل پر اعتراض کیوں ہوتا۔

بے شمار لڑکیوں سے تعلقات رکھنے کے باوجود اب بھی رابیل علی میرے سینے میں ایک خنجر کی طرح گڑی ہوئی تھی شاید وہ میری پہلی اور اب تک کی واحد شکست ہے اس لیے میں اسے زیادہ یاد کرتا ہوں یا پھر ہاں آسان لفظوں میں یہ مان لینا زیادہ آسان ہے کہ میں رابیل علی سے محبت کرتا آ رہا ہوں۔ وہ واحد حقیقت ہے جسے ماننے میں مجھے کوئی عار نہیں۔ مجھے کبھی بھی یہ توقع نہیں رہی تھی کہ اب دوبارہ کبھی اس سے میرا سامنا ہو پائے گا لیکن ایسا ہو ہی گیا۔

میں ایک ٹیسٹ میچ کھیلنے کے لیے فیصل آباد گیا تھا۔ ائیر پورٹ کے وی آئی پی لاؤنج تک پہنچتے پہنچتے میں لوگوں سے ہاتھ ملاتے اور آٹوگراف دیتے دیتے کافی تھک چکا تھا اور تھکنے سے زیادہ میں اکتایا ہوا تھا۔ اسی لیے لاؤنج میں پہنچ کر میں اپنی کٹ اور بیگ رکھ کر چائے پینے بیٹھ گیا تھا تا کہ لوگ مجھے چائے پیتا دیکھ کر میری طرف نہ آئیں۔ میرے ساتھ دو تین دوسرے پلیئرز بھی شامل ہو گئے تھے۔

چائے کے سپ لیتے ہوئے اچانک میری نظر اس لڑکی پر پڑی تھی جو ہماری ٹیم کے مینجر، کوچ اور کیپٹن سے

مصروف گفتگو تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی اس لیے میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ پایا لیکن نہ جانے کیوں مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز بہت مانوس سا لگا تھا پھر بات کرتے کرتے اس نے چہرے کو موڑا تھا اور میرے ہاتھ سے چائے کا کپ چھوٹتے چھوٹتے بچا وہ بلاشبہ رابیل علی تھی۔ اس کے چہرے کا ایک ایک نقش میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ میں تو لاکھوں کے مجمع میں بھی اسے پہچان جاتا۔ لاؤنج میں تو پھر چند درجن لوگ تھے۔

میں ایک عجیب سے عالم میں صوفہ سے ٹیک لگائے اسے دیکھتا رہا۔ وہ اب بھی پہلے ہی کی طرح تھی۔ بلیک کڑھائی والے سفید شلوار سوٹ کے ساتھ وہ بلیک کوٹ میں ملبوس تھی۔ بال اب بھی اسٹیپس ہی میں کٹے ہوئے تھے لیکن ان کی لمبائی میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ ہاں اب بالوں میں کوئی ہیئر بینڈ نہیں تھا جو ایک زمانے میں اس کا ٹریڈ مارک سمجھا جاتا تھا۔ اپنے دراز قد کے ساتھ وہ لاؤنج میں بہت نمایاں تھی۔

میں ایک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر تک اس کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد ہماری ٹیم کا کیپٹن میرے صوفے کی طرف بڑھ آیا تھا جب کہ وہ ہمارے ٹیم مینجر کے ساتھ لاؤنج سے باہر چلی گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل چاہا کہ میں بھاگ کر اس کے پیچھے جاؤں مگر میں جانتا تھا یہ ممکن نہیں تھا۔ اب میں ایک اسٹار بولر تھا اور میڈیا کے اتنے بہت سے لوگوں کے سامنے ایسی کوئی حرکت اگلے ہی دن اخبار میں شائع ہو جاتی سو میں نے خود پر قابو پا لیا تھا لیکن اپنی ٹیم کے کپتان کے صوفے پر بیٹھتے ہی میں نے ایک لمحے کا انتظار کیے بغیر پوچھا تھا:

''وہ لڑکی کون تھی جس سے آپ باتیں کر رہے تھے؟''

''اوہ...... وہ رابیل علی تھی۔ یہاں کی اسسٹنٹ کمشنر ہے۔ میچ کے سارے انتظامات بھی اس کی زیر نگرانی ہوئے ہیں۔ وہ چاہ رہی تھی کہ ہم ابھی کچھ دیر بعد اسٹیڈیم جا کر ایک دفعہ وہاں کی ارینجمنٹ کا جائزہ لے لیں تاکہ اگر کسی چیز کی کمی ہو تو وہ پوری کی جاسکے۔ میں مینجر اور کوچ کے ساتھ تھوڑی دیر تک اسٹیڈیم جاؤں گا۔''

وہ مجھے بتا کر چائے پینے میں مشغول ہو گیا۔

''کیا یہ لڑکی واقعی اسسٹنٹ کمشنر تھی؟''

یہ سوال میرے ساتھ صوفے پر بیٹھے ہوئے ناصر نے کیا تھا۔ اس کے لہجے میں تجسس آمیز اشتیاق تھا۔

''ہاں بالکل ہے تمھیں شبہ کیوں ہو رہا ہے؟''

ٹیم کیپٹن نے مسکراتے ہوئے ناصر سے کہا تھا۔

''اگر میں بھی اسٹیڈیم چلوں تو؟'' میں نے گفتگو میں مداخلت کی۔

''وائے ناٹ شیور۔'' کیپٹن نے بڑی فراخدلی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تھا۔ کچھ دیر تک ہم وہیں بیٹھے رہے پھر ٹیم کے لیے کوسٹر آ گئی تھی اور سب کھلاڑیوں نے اپنا سامان اٹھانا شروع کر دیا۔

''ہم لوگ ہوٹل نہیں جائیں گے، یہیں سے گراؤنڈ چلیں گے اس لیے تم اپنا سامان اور کٹ کسی پلیئر کو دے آؤ تاکہ وہ اسے ہوٹل لے جائے۔'' کپتان نے مجھے کہا تھا اور میں سر ہلاتا ہوا اپنا سامان لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

کوسٹر تک جانے اور ٹیم کے فزیو کو سامان دینے میں دس منٹ لگے تھے اور جب میں واپس وی آئی پی لاؤنج

کی طرف آنے لگا تو وہ ٹیم مینجر کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی لاؤنج سے نکل رہی تھی۔ میرے قدم اسے دیکھ کر رک گئے تھے۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا لیکن شناسائی نام کی کوئی چیز اس کے چہرے پر نہیں جھلکی تھی۔ ٹیم مینجر اس کے ساتھ چلتے ہوئے آ کر میرے پاس رک گئے۔

"احسن، ساجد کہہ رہا تھا کہ تم بھی ہمارے ساتھ جانا چاہ رہے ہو؟" انھوں نے مجھ سے استفسار کیا میں نے اثبات میں سر ہلایا تھا مینجر نے اس سے میرا تعارف کروایا تھا۔

"یہ رابیل علی ہیں یہاں کی اسسٹنٹ کمشنر اور میرے خیال میں انھیں تو آپ جانتی ہی ہوں گی یہ احسن منصور ہیں دنیا کے ٹاپ آل راؤنڈرز میں شمار ہوتا ہے ان کا۔ ویسے یہ باؤلرز زیادہ اچھے ہیں۔"

"بالکل جانتی ہوں میرا جنرل نالج کافی اچھا ہے۔ مجھے مشہور اور اہم لوگوں کے بارے میں کافی معلومات ہوتی ہیں...... السلام وعلیکم کیسے ہیں آپ؟" اس نے مینجر سے بات کرتے ہوئے اچانک مجھے مخاطب کیا تھا:

"میں ٹھیک ہوں لیکن میرا جنرل نالج ہمیشہ سے ہی خراب ہے مجھے اہم لوگوں کے بارے میں بھی کچھ پتا نہیں ہوتا۔"

میرا لہجہ بہت معنی خیز تھا لیکن وہ کسی قسم کا نوٹس لیے بغیر بولی:

"یہ آپ کا ہی نہیں بہت سے لوگوں کا مسئلہ ہوتا ہے لیکن آپ کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، آپ کرکٹر ہیں اور کرکٹرز کا جنرل نالج جتنا خراب ہوتا ہے وہ اتنا ہی اچھا پرفارم کرتے ہیں۔ کم از کم ہماری ٹیم کا ریکارڈ تو اس بات کا گواہ ہے۔"

ہمارے ٹیم مینجر نے اس کی بات پر ہلکا سا قہقہہ لگایا اور میں قدرے جھینپ گیا اس کے جملوں میں ابھی بھی وہی پرانی کاٹ تھی جس کے لیے وہ مشہور تھی۔

ہم اس کے ساتھ چلتے ہوئے باہر آ گئے تھے۔ جہاں دو گاڑیاں ہماری منتظر تھیں۔ ایک گاڑی میں پہلے ہی ہمارے کوچ اور کیپٹن براجمان تھے۔ اس لیے مجھے دوسری گاڑی میں ٹیم مینجر اور رابیل علی کے ساتھ بیٹھنا پڑا وہ فرنٹ سیٹ پر ڈرائیور کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی اور تمام راستے ہمارے مینجر کے ساتھ بڑے پروفیشنل انداز میں انتظامات کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔

ایک ہفتہ تک ہم فیصل آباد رہے اور ان سات دنوں میں تقریباً روزانہ ہی دو تین بار اس سے میرا آمنا سامنا ہوتا رہا۔ وہ بڑے خوشگوار انداز میں مجھ سے حال احوال پوچھتی رہی اور مجھے اس خوش فہمی میں مبتلا کرتی رہی کہ شاید میرے بارے میں اس کی سوچ بدل چکی ہے اب وہ بھی میرے لیے اچھے جذبات رکھنے لگی ہے۔ سو اس ہفتہ میں اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کر چکا تھا۔

ٹیسٹ میچ کے آخری دن مقامی انتظامیہ کی طرف سے دونوں ٹیموں کو عشائیہ دیا گیا تھا۔ عشائیہ ایک مقامی ہوٹل میں دیا گیا تھا۔ رابیل بھی وہاں موجود تھی۔ عشائیہ کا ابھی باقاعدہ آغاز نہیں ہوا تھا جب میں نے رابیل کے پاس جا کر کہا تھا کہ میں اس سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں وہ دوسرے لوگوں سے ایکسکیوز کرتی ہوئی بڑی خوش دلی سے میرے

ساتھ آ گئی تھی ہم ہال سے نکل کر ہوٹل کے عقبی لان کی طرف آ گئے تھے۔

''بیٹھیں۔'' میں نے لان میں پڑی چیئرز کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی ایک چیئر کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''آپ کچھ کہنا چاہتے تھے مجھ سے؟'' اس نے چیئر پر بیٹھتے ہی مجھ سے سوال کیا تھا۔

میں اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ پرپل سوٹ میں ملبوس تراشیدہ بالوں کو ماتھے سے ہٹاتے ہوئے بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ پہلی خوبصورت لڑکی تھی جسے میں نے دیکھا تھا جن لڑکیوں سے میری دوستی تھی ان کے سامنے رابیل علی بہت عام، بہت معمولی نظر آتی تھی۔ لیکن بس یہ دل تھا جسے اس کے سامنے ہر خوبصورتی ماند نظر آتی تھی اور میں تھا جس پر بس اس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

کسی تمہید کے بغیر میں نے وہ جملہ کہہ دیا تھا جسے بولنا مجھے ایک بہت دشوار گزار عمل لگتا تھا۔

صرف ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر حیرانگی جھلکی تھی لیکن پھر اس کا چہرہ بے تاثر ہو گیا تھا اور بڑی پرسکون آواز میں اس نے کہا تھا:

''یہ ممکن نہیں ہے۔''

''کیوں ممکن نہیں ہے؟'' میں نے بڑی بے تابی سے اس سے پوچھا تھا۔

''کیونکہ میری منگنی ہو چکی ہے اور چند ماہ تک میری شادی ہونے والی ہے۔''

اس کی بات سن کر مجھے یوں لگا تھا جیسے اب میں کبھی سانس نہیں لے پاؤں گا جیسے زمین کی گردش یک دم رک گئی تھی۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا اپنی آواز مجھے جیسے کسی اندھے کنوئیں میں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

''کون ہے وہ؟''

''اس کا نام ضیغم حیدر ہے۔ وہ ایک سی، ایس، پی آفیسر ہے اور آج کل انٹریئر منسٹری میں کام کر رہا ہے۔''

''کیا یہ لو میرج ہے؟'' میں نے بہت دھیمی آواز میں پوچھا تھا۔

''ویل، میں اسے لو میرج تو نہیں کہہ سکتی ہاں البتہ یہ پسند کی شادی ضرور ہوگی۔ اصل میں ہم دونوں ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ ہماری بہت اچھی دوستی تھی اور انڈر اسٹینڈنگ بھی، سو اس نے مجھے پروپوز کر دیا اینڈ دیٹس اٹ۔''

''کیا تم سے مجھ سے زیادہ محبت کوئی کر سکتا ہے؟''

میں نے بہت تیز آواز میں کہا۔ وہ چند لمحوں تک ناگواری سے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر شستہ انگریزی میں بولی:

''پتا نہیں مجھے یہ خوش فہمی کیوں ہو گئی تھی کہ تمہارا دماغ اب ٹھیک ہو گیا ہوگا لیکن ایسا نہیں، تم اب تک بالکل ویسے ہی ہو، تم میں بالکل فرق نہیں آیا۔''

''ہاں میں آج بھی وہی ہوں۔ جو تم سے محبت کرتا تھا اور آج بھی بے تحاشا محبت کرتا ہوں۔''

میں نے اسی کی روانی سے انگریزی ہی میں اسے جواب دیا تھا۔
"تمھیں اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے شرم کیوں نہیں آتی؟ کیا تم کو یاد بھی ہے کہ کتنی لڑکیوں سے تم نے یہی جملہ کہا ہوگا؟ شاید تمھیں ان کی تعداد بھی یاد نہیں ہوگی۔"
اس نے بڑے سرد مہر لہجے میں مجھ سے کہا۔
"میں نے آج تک یہ جملہ صرف ایک لڑکی سے کہا ہے اور وہ تم ہو سو مجھے تعداد اچھی طرح یاد ہے۔"
"تم کیا ہر لڑکی سے یہی کہتے ہو؟"
اس نے بڑے تیکھے انداز میں مجھ سے پوچھا تھا۔
"تمھیں ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ میں ہر لڑکی سے یہ بات کہتا پھر رہا ہوں۔ یہ صرف تم ہی ہو جسے میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔" میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے بڑے اکتائے ہوئے انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔
"آل رائٹ، آل رائٹ مانا کہ تم بہت پارسا ہو لیکن مجھے تمہاری پارسائی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، میرے خیال میں اب مجھے چلنا چاہیے ڈنر شروع ہونے والا ہے۔"
اس نے ٹیبل پر رکھے ہوئے اپنے ہینڈ بیگ پر ہاتھ رکھا اور میں نے یک دم اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"مجھے تم سے ابھی بہت کچھ کہنا ہے، تم سنے بغیر نہیں جا سکتیں۔"
اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے میں نے بڑے بے خوف انداز میں کہا تھا۔
"میرا ہاتھ چھوڑ دو۔" اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کیے بغیر مجھے کہا تھا۔
"میں نہیں چھوڑوں گا۔" ایک عجیب سی ضد مجھ پر سوار ہو گئی تھی۔
"تم چھوڑ دو گے ضرور چھوڑ دو گے۔ اگر ایسے نہیں تو بے عزت ہو کر چھوڑ دو گے۔ میں تمہاری کوئی فین ہوں نہ ہی کوئی گرل فرینڈ جس کے ساتھ تم رومانس لڑانے کے لیے یہاں بیٹھے ہو۔ میرے ایک اشارے، ایک آواز پر تم پولیس اسٹیشن میں ہو گے اور تمہاری کوئی شہرت اور کارکردگی تمھارے کسی کام نہیں آئے گی، تم ہیرو سے زیرو بن جاؤ گے سو بہتر ہے کہ ایسی کسی صورت حال سے پہلے ہی میرا ہاتھ چھوڑ دو۔"
اور میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ اپنی کمزور پوزیشن کا احساس مجھے ہو گیا تھا لیکن ایسا نہیں تھا کہ اس کا جنون میرے سر سے اتر گیا تھا۔
"مجھے صرف ایک بات بتا دو جس شخص سے تم شادی کر رہی ہو، اس میں ایسی کون سی خوبی ہے جو مجھ میں نہیں اس کے پاس وہ کون سی چیز ہے جو میں تمھیں نہیں دے سکتا؟"
میں نے ہاتھ چھوڑتے ہی اس سے سوال کر دیا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا کر یک دم بڑے اطمینان سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔
"آل رائٹ، میرا خیال ہے مجھے تمھیں آئینہ دکھانا ہی پڑے گا۔ تم کرکٹرز، ایکٹرز اور politicians اصل

میں خوش فہمی کے کیڑے ہوتے ہو۔ ساری عمر خوش فہمی پر پلتے رہتے ہو اور ذرا سی حقیقت سامنے آنے پر ایسے تڑپنے لگتے ہو جیسے جونک پر نمک ڈال دیا جائے کیا تم سچ سننے کا حوصلہ رکھتے ہو؟''

''تمھارے منہ سے میں سب کچھ سن سکتا ہوں چاہے وہ کتنی ہی کڑوی بات کیوں نہ ہو۔''

''ویل سیڈ، او کے پھر مجھے بتاؤ کہ تمھارے پاس ہے کیا، تعلیم ہے؟''

اس کا لہجہ زہریلا تھا اور سوال اس سے بھی زیادہ تلخ۔

''تعلیم سے کیا ہوتا ہے؟ یہ کوئی اتنی بھی اہم چیز نہیں ہے۔''

میں نے بڑا کمزور سا دفاع کیا تھا۔

''ٹھیک ہے بقول تمھارے تعلیم کوئی اتنی بھی اہم چیز نہیں ہے تو چلو مان لیتے ہیں لیکن یہ بتاؤ کہ اچھا کردار ہے تمھارے پاس؟''

''تمھیں میرے کردار میں کیا خامی نظر آتی ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا تھا۔

''تمھارے اسکینڈلز......''

''میرے اسکینڈلز کی بات مت کرو یہ سب میڈیا کی بلیک میلنگ ہے۔ پتا نہیں کیسی اسٹوریز بنا کر چھاپتے رہتے ہیں۔'' میں نے مشتعل ہو کر اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''میں نہیں جانتی تھی کہ مجھے کبھی اس طرح تمھیں اصلی چہرہ دکھانا پڑے گا ورنہ میں تمھارے بارے میں شائع ہونے والی خبریں زیادہ دھیان سے پڑھتی بلکہ اکٹھی کر کے رکھ لیتی لیکن کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ سارے ہی اخبارات تمھارے افیئرز چھاپتے رہتے ہیں بلکہ لوکل یا نیشنل پریس کو تو چھوڑو انگلینڈ کے پریس کو بھی تم سے پرخاش ہو گئی ہے۔ وہ بھی تمہارا ایک سے ایک افیئر سامنے لاتا رہتا ہے۔ تمھیں یہ بلیک میلنگ اس لیے لگتی ہے کیونکہ وہ لوگوں کے سامنے تمہاری اصلیت ظاہر کر دیتے ہیں۔ لیکن یاد رکھو یہ وہی اخبارات ہیں جو تمھارے کھیل کے کارناموں کو جلی حروف میں شائع کرتے ہیں، جنھوں نے تمھیں بولنگ کی دنیا کا دیوتا بنا دیا تھا اور تمھیں لگتا ہے کہ وہ تمھیں بدنام کر رہے ہیں۔ تم یہ کیوں نہیں مان لیتے کہ تم اخلاقی طور پر بہت گر چکے ہو۔''

''رابیل بس یہ سب بند کرو۔'' میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اسے بولنے سے روک دیا۔

''اگر یہ سب سچ ہے بھی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تم سے شادی کے بعد یہ سب چھوڑ دوں گا۔ ٹھیک ہے کچھ غلطیاں مجھ سے ضرور ہوئی ہیں لیکن ایسی غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں لیکن میں تمھارے لیے اپنے آپ کو بدل لوں گا۔ تم مجھے جیسا چاہو گی میں ویسا بن کر دکھاؤں گا۔''

اپنے جملے کے اختتام پر میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے شعلے لپک رہے تھے۔

''جو مرد کسی عورت سے یہ کہتا ہے کہ وہ اس کے لیے اپنے آپ کو بدل دے گا، اس سے بڑھ کر فراڈ اور مکار کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ جو شخص اپنے مذہب کے لیے اپنی پارسائی برقرار نہیں رکھ سکتا، جو شخص اپنے خاندان کی عزت اور نام

کے لیے اپنی آوارگی پر قابو نہیں پا سکتا، جو شخص اپنے ماں باپ کے پڑھائے ہوئے تمام سبق بھول کر پستی کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے جو خود اپنی نظروں میں اپنا احترام اور عزت باقی رکھنے کی پروا کیے بغیر عیاشی کرتا ہے وہ کسی عورت کے لیے خود کو کیا بدلے گا؟

تمہاری اس بات نے تمھیں میری نظروں میں اور گرا دیا ہے۔ آخر میں تمھارے جیسے آوارہ اور بدکردار شخص کو اپنا شوہر کیسے بنا سکتی ہوں؟ تمھیں ایک ایسے شخص پر ترجیح کیسے دے سکتی ہوں۔ who is a thorough gentleman.

یہ جو تم کرکٹرز ٹائپ کی چیزیں ہوتے ہونا، پتا نہیں کیسے یہ کیڑا تم لوگوں کے دماغ میں گھس جاتا ہے کہ تم لوگ جہاں جاؤ گے لوگ تمھیں پلکیں بچھائے ملیں گے۔ جس سے ملو گے وہ تم لوگوں کو ear to ear smile دیتا پھرے گا جس چیز کی طرف ہاتھ بڑھاؤ گے، وہ مقناطیس کی طرح کھینچتی ہوئی تمہاری طرف آ جائے گی۔ تم لوگ تو پانی میں بننے والے بلبلوں کی طرح ہوتے ہو جن کا نہ کوئی ماضی ہوتا ہے نہ مستقبل، جب تک وہ ہوتے ہیں پانی پر بس وہ ہی وہ نظر آتے ہیں اور جب غائب ہوتے ہیں لگتا ہی نہیں کہ کبھی پانی پر ان جیسی کوئی چیز نمودار ہوئی ہوگی۔

ایک شاٹ یا ایک وکٹ تم لوگوں کو لائم لائٹ میں لے آتی ہے اور تمہاری بدقسمتی یہ ہے کہ تم لوگوں کو غائب بھی یہی چیزیں کرتی ہیں۔ تمھیں آخر کیا کمپلیکس ہے؟ یہ کہ تم خوبصورت ہو، یہ کہ تمھارے پاس بے تحاشا دولت ہے، یہ کہ تمھارے پاس شہرت ہے یا یہ کہ تمھارے پاس یہ سب کچھ ہے؟ لیکن اس دنیا میں موجود ہر لڑکی کی خواہش صرف یہ چیزیں نہیں ہو سکتیں۔''

''ہاں مگر بہت سی لڑکیوں کی خواہش صرف یہ چیزیں ہی ہوتی ہیں اور تم اسے جھٹلا نہیں سکتیں۔''

اس کی بہت سی باتیں سننے کے بعد میں نے اس سے کہا تھا۔ ایک عجیب سی افسردگی مجھے اپنی گرفت میں لے رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا حقیقت پسندانہ تجزیہ میرے لیے کتنا تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔

''ہاں مگر میں ان لڑکیوں میں شامل نہیں ہوں۔'' اس نے بڑے مستحکم انداز میں کہا تھا۔

''تمہارا پلس پوائنٹ تمہاری دولت ہے، تمہاری شہرت ہے مگر یہ دونوں چیزیں تو چور کے پاس بھی ہوتی ہیں لیکن لڑکیاں اسے اپنا آئیڈیل بنائے نہیں پھرتیں۔''

''اوہ لیکن میں بہت سی لڑکیوں کا آئیڈیل ہوں اور میں چور بھی نہیں ہوں۔''

میں طنزیہ آواز میں کہہ کر ہنسا تھا۔

''ہاں تم بہت سی لڑکیوں کے آئیڈیل ہو اور تم چور بھی نہیں ہو لیکن کیا تم نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ تم کن لڑکیوں کے آئیڈیل ہو؟ تم میٹرک سے لے کر ماسٹرز تک کسی بھی ایگزام میں ٹاپ کرنے والی کسی بھی لڑکی کے فیورٹ پلیئر تو ہو سکتے ہو لیکن آئیڈیل نہیں نہ ہی تم ڈاکٹر، انجینئر، پائلٹ، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ، لیکچرار اور سی ایس پی آفیسر لڑکی کا آئیڈیل ہو سکتے ہو۔ ہاں مگر تم ان لڑکیوں کا آئیڈیل ضرور ہو سکتے ہو جو یا تو تمھارے جیسا ذہن رکھتی ہوں گی یا جنھیں تمہاری طرح تعلیم یا اپنے کیریئر سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی، جن کی زندگی کا واحد مقصد شادی ہوتا ہے، وہ

سپر اسٹار احسن منصور سے ہو جائے یا پھر گلی کے کسی بھی چکر باز سے جو تمہاری طرح ان پر جان نثار کرنے کا دعویٰ کرے۔ ایسی ہی لڑکیاں ہوتی ہیں جو تم جیسے کرکٹرز یا ایکٹرز پر نثار ہوتی ہیں یا جو تم لوگوں کو اپنا آئیڈیل بنائے پھرتی ہیں یا جو اپنی کتابوں یا کمرے کی دیواروں کو تم لوگوں کی تصویروں سے سجائے رکھتی ہیں۔ ہم جیسی لڑکیاں نہیں، ہمارے پاس تو تم لوگوں کے بارے میں سوچنے کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا کیونکہ تم لوگوں نے آخر ایسا کون سا کارنامہ سرانجام دیا ہوتا ہے کہ ہم تمھارے بارے میں وقت نکال کر سوچا کریں۔

ہاں تم لوگ ہمارے لیے ٹائم پاس کا ایک اچھا ذریعہ ہوتے ہو۔ اپنی مصروفیات سے تھک گئے یا تنگ آ گئے تو ایک فلم دیکھ لی یا کوئی میچ دیکھ لیا اور تھوڑی ذہنی تفریح کر لی اینڈ دیٹس آل اس سے زیادہ اہمیت نہیں ہوتی ہمارے لیے تم لوگوں کی۔

کرکٹ کو مائنس کر دیں تو ہے کیا تمہاری ذات میں؟ جس کے بارے میں بات کی جا سکے یا جو قابل غور ہو، تعلیم تمھارے پاس نہیں ہے، کردار تمہارا اچھا نہیں ہے، بات کرنے کا سلیقہ اور ڈھنگ تم کو نہیں ہے، چند دن پرانی ہاتھ لگی دولت کو شو آف کے لیے تم استعمال کرتے ہو اور پھر بھی بضد ہو کہ مجھ میں ایسی کون سی خوبی نہیں ہے جو آپ کے ہونے والے شوہر میں ہے۔

جب تک کرکٹ کھیل رہے ہو، سب کی آنکھوں میں ہو جس دن یہ چھوڑ دو گے تو کسی کے پیروں میں بھی جگہ نہیں ملے گی۔ تمہارا کیریئر ہے بھی کتنا؟ اس وقت تم چوبیس یا پچیس سال کے ہو گے۔ اگر مان لیا جائے کہ دس سال اور کرکٹ کھیلو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پینتیس سال کے بعد تمہارا کیریئر گلیمر اور شہرت سب ختم ہو جائے گا اور اگر میں تمھیں ضیغم سے کمپیئر کروں تو مجھے تمھیں یہ بتاتے ہوئے بڑی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ اس کا کیریئر آج سے دس سال کے بعد عروج کی طرف گامزن ہو گا اور شاید سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی وہ کانٹریکٹ پر کچھ سال جاب کرے سو اس کا کیریئر پینسٹھ سال کی عمر میں ختم ہو گا۔ سو تم میں اور اس میں تو کوئی comparison ہی نہیں بنتا۔

تم تعلیم میں اس کے برابر نہیں ہو، تم عہدے میں اس کے برابر نہیں ہو، تم کردار میں اس کے برابر نہیں ہو، ہاں شہرت، دولت اور خوبصورتی میں تمھیں کچھ سبقت حاصل ہے لیکن مسٹر احسن منصور یہ چیزیں میری ترجیحات میں کبھی بھی شامل نہیں رہیں۔ ہر مرد اور ہر عورت شادی کے لیے لائف پارٹنر کا انتخاب کرتے ہوئے اپنے سے بہتر شخص کا انتخاب کرتا ہے مجھے ضیغم خود سے بہتر لگتا ہے اس لیے میں اس سے شادی کر رہی ہوں اور تم مجھے خود سے بہت کمتر لگتے ہو پھر میں تم سے شادی کیسے کر سکتی ہوں؟

تمھارے لیے مناسب یہ ہے کہ کسی ایسی لڑکی کا انتخاب کرو جو تمھیں خود سے بہتر سمجھے اور جن لوگوں کی کمپنی میں تم رہتے ہو تمھیں ایسی لڑکیوں کی کمی نہیں ہو گی۔

میں امید کرتی ہوں کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہو گی۔ آئندہ مجھ سے آپ کا سامنا ہو بھی تو کسی قسم کی شناسائی ظاہر کرنے کی کوشش مت کیجئے گا اور نہ ہی کوئی توقعات وابستہ کیجئے گا ورنہ آپ کو آج سے زیادہ تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

وہ اپنا بیگ اٹھا کر بڑے مستحکم قدموں سے ہوٹل کے ہال کی طرف بڑھ گئی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے ساری دنیا چندلمحوں کے لیے ٹھہر گئی تھی، خاموش ہوگئی تھی، میں اندر ہوٹل کے ہال میں نہیں جاسکا بس وہاں سے بھاگ آیا۔ اسے دوبارہ دیکھنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی اس لیے کسی کو اطلاع دیے بغیر ہوٹل سے اپنا سامان لے کر فلائنگ کوچ کے ذریعے اسی رات فیصل آباد سے لاہور پہنچ گیا، جانتا تھا ٹیم مینجمنٹ مجھے اس حرکت پر فائن کرے گی پر تب مجھے ہوش ہی کہاں تھا۔

علی الصبح میں گھر پہنچا تھا۔ گھر والوں کے سوالوں سے بچتا ہوا کچھ کہے بغیر میں اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے اپنے بیگ دور پھینک دیے تھے۔ پھر بہت دیر تک سر کو ہاتھوں میں تھامے میں صوفے پر بیٹھا رہا۔

اس کی ایک ایک بات میرے ذہن میں گھوم رہی تھی۔ میں احسن منصور ایک رات میں آسمان سے زمین پر آ گیا تھا۔

''تم لوگ خوش فہمی کے کیڑے ہوتے ہو۔'' اس نے کہا تھا۔ ''ساری عمر خوش فہمی پر پلتے رہتے ہو اور ذرا سی حقیقت سامنے آنے پر ایسے تڑپنے لگتے ہو جیسے جونک پر نمک ڈال دیا جائے۔''

ہاں اس نے ٹھیک کہا تھا کاش یہ بات کوئی مجھے بہت پہلے کہہ دیتا۔

''تم لوگ پانی پر بننے والے بلبلے ہو جس کا نہ کوئی ماضی ہوتا ہے نہ مستقبل۔ میں تم جیسے آوارہ شخص سے شادی کیسے کرسکتی ہوں؟ جس سے میں شادی کر رہی ہوں اس کے پاس اچھا کردار ہے جو تمھارے پاس نہیں ہے۔''

میرا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔

''تم کرکٹرز اور ایکٹرز ہمارے لیے صرف ٹائم پاس کا ایک ذریعہ ہو اور کچھ نہیں۔''

''احسن کیا بات ہے ایسے کیوں بیٹھے ہو؟''

میں نے سر اٹھایا تھا۔ امی میرے پاس کھڑی تھیں۔ پتا نہیں وہ کس وقت کمرے میں آ گئی تھیں۔

''تم ٹھیک تو ہو نا؟'' وہ پوچھتے ہوئے میرے پاس صوفہ پر بیٹھ گئیں۔ میں خاموشی سے ان کا چہرہ تکنے لگا۔

''کوئی پریشانی ہے کیا؟ میچ تو تم جیت گئے تھے پھر کیا مسئلہ ہے؟''

ایک لحہ انھیں ساکت تکتے رہنے کے بعد میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ میں کیا چیز ہار آیا تھا یہ وہ کبھی نہیں جان سکتی تھیں۔ آخر زندگی صرف میچ ہی تو نہیں ہوتی۔

''احسن میرے بیٹے میری جان کیا ہوا ہے تمھیں؟'' امی مجھے اپنے ساتھ لپٹا کر کہہ رہی تھیں۔

''تم میں ایسا کچھ نہیں ہے جو میرے لیے باعث کشش ہو۔'' میرے کانوں میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔

''کچھ نہیں ہوا امی بس آپ مجھے بہت یاد آ رہی تھیں۔''

''ہر شخص اپنے سے بہتر شخص سے شادی کرتا ہے لیکن تم کسی طور بھی مجھے خود سے بہتر نہیں لگتے۔''

''لو بھلا اس میں رونے والی کیا بات ہے؟ اب تم بڑے ہو چھوٹے بچے تو نہیں ہو کہ اتنی سی بات پر رونے

بیٹھ جاؤ۔'' امی میرا ماتھا چومتے ہوئے بول رہی تھیں۔

''آئندہ کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تمھیں پہلے سے زیادہ تکلیف ہوگی۔''

پچھلی ساری زندگی میں نے نارمل بن کر گزاری تھی مگر اب مجھے ساری زندگی ابنارمل رہنا تھا۔